اندھیرے میں سلگتے حروف

سرجیت پاتر

اندھیرے میں سُلگتے حُروف

ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ پنجابی نظمیں

اندھیرے میں سُلگتے حُروف

سُرجیت پاتر

ترجمہ

بلراج کومل

ساہتیہ اکادمی

Andhere mein sulagte Huroof : Urdu translation by Balraj Komal of Surjit Patar's Akademi award winning Punjabi poems *Andhere mein Sulagti Varnmala*. Sahitya Akademi, New Delhi (2001), Rs. 50.

پہلا ایڈیشن : ۲۰۰۱ء

ساہتیہ اکادمی

ہیڈ آفس :

رویندر بھون - ۳۵ فیروز شاہ روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

سیلز آفس :

سواتی، مندر مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

علاقائی دفاتر:

جیون تارا بھون، ۲۳ اے/۴۴ ایکس، ڈائمنڈ ہاربر روڈ، کلکتہ ۷۰۰۰۵۳

شاردا سنیما بلڈنگ، دادر، ممبئی ۴۰۰۰۱۴

سینٹرل کالج، ڈاکٹر امبیڈکر ویدھی، بنگلور ۵۶۰۰۰۱

سی - آئی - ڈی - کیمپس، ٹی - ٹی - آئی - پوسٹ تارامنی، چنئی ۶۰۰۱۱۳

قیمت : ۵۰ روپے

ISBN 81-260-1310-9

Website : http://www.sahitya-akademi.org

کمپیوٹر کمپوزنگ: محمد سالم ۲/۳۱۶ ۲۷ ترلوک پوری، دہلی ۱۱۰۰۹۱

طباعت : کلر پرنٹر، دلّی ۱۱۰۰۳۲

ترتیب

ابتدائیہ

یہ میرے لہو کے رسم الخط کے اداس
میرے اندھیرے کے حُروف
اداس اپنشد
تپتی تاریخ
میرا مجروح گیت
ایک سلگتی کتاب
یہ پگڈ ندی ہے
میرے گاؤں سے میری کتاب کی دھندلی سطروں تک
یہ پگڈ ندی ہے
میری ماں کی محبت بھری اداس آنکھوں سے
میرے باپ کی جلاوطنی تک
یہ پگڈ ندی ہے
اندھی اپَھرا اں کے کانپتے ہاتھوں سے
پورن کے چہرے تک
صبح کاذب کی دہلیز سے
شام کی درگاہ تک

شام جو میرے اداس پیڑوں کی خاموش عرض داشت ہے

آج اس شام کے ساحل پر
میں اپنے سینے کے اندر کی آگ کے چراغوں کو
پانی میں بہادیتا ہوں
پانی میں بہادیتا ہوں یادوں کی استھیاں
اپنے لہو کے چہکتے بولتے پھول

یہ پانی جو اجداد کے کہسار سے
وارثوں کے دیس تک بہتا ہے

پانی کا سفر ازلی اور ابدی ہے
چراغوں کا صرف چند لمحوں کے لیے

میں اس شام کے دھندلکے میں
نظر کی حد تک
اپنے چراغوں کو جگمگاتے، تیرتے
دیکھنے کا شدت سے آرزومند ہوں

اس حرص وہوس کے لیے، میری صبح کے خدا
مجھے معاف کرنا

یہ کوِتا کچھ بھی نہیں
تپتی انا کا منظوم درد و کرب ہے
ایک ہجر کے مارے دل کی فریاد ہے

یہ کچھ بوندیں ہیں
جو میں نے تپش سہتی روح سے کشید کی ہیں

یہ ایک گواہی ہے
کہ
اداس اندھیرا اسی طرح لکھتا ہے

میرے دریاؤں کا نام

ماتم
تشدد
خوف
بے بسی
ناانصافی
یہ ہیں آج کل میرے دریاؤں کے نام

بوڑھی جادوگرنی کہتی ہے

تیرا ہی نام رکھیں گے
تیرے سینے پر بھی خنجر یا تمغہ رکھ دیں گے
جینے کے قابل تو بن
تجھے بھی قتل کر دیں گے

میں بوڑھی جادوگرنی بہت سے منتر جانتی ہوں

میں نے جس سینے پر تمغہ سجایا ہے
وہی سینہ وقت کا آئینہ بن کر رہ گیا ہے

میں نے جس شخص کے گلے میں ہار پہنایا ہے
وہی بُت بن گیا ہے

میں نے جس کو اپنا بیٹا کہا ہے
اس کو اپنی ماں کا نام بھول گیا ہے

میں نے جس ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا ہے
وہی ہاتھ پیڑ کی ٹہنی بن گیا ہے
اور ہر سمت سے آنے والی ہوا میں ڈول گیا ہے

میرا پیٹ ہنستا ہے، شیشہ جھوٹ بولتا ہے
جادوگرنیاں تو کبھی جھوٹ نہیں بولتی ہیں

سینے بھی کئی قسم کے ہوتے ہیں
کسی سینے کو تمغے سے سکون ملتا ہے
کسی دوسرے کو نیم گرم دودھ کے نغمے سے

جو باقی بچ جاتا ہے
اس کے لیے میرے ہاتھوں میں صرف خنجر ہی رہ جاتا ہے

تو بلاوجہ غرور نہ کر
تو بلاوجہ جلدی نہ کر
تیرا سینہ کس قسم کا ہے۔ یہ بھی پہچان لیں گے
اور تجھے بھی تیرے مقابلے کے مقدّر سے منسلک کر دیں گے
جینے کے لائق تو بن
تجھے بھی قتل کر دیں گے

اب گھروں کو لوٹنا۔۔۔

اب گھروں کو لوٹنا بڑا مشکل ہے

ہمیں کون پہچانے گا
ماتھے پر موت دستخط کر گئی ہے
چہرے پر دوست قدموں کے نشان چھوڑ گئے ہیں
آئینے میں کوئی غیر جھانکتا ہے
آنکھوں میں کوئی چمک ہے
کسی شکستہ مکان کی چھت میں سے
آتی ہوئی مدّھم روشنی جیسی

ڈر جائے گی میری ماں
میرا بیٹا، میرے سے بڑی عمر کا
کس سادھو کے شراپ
کسی بدنیت حریفہ کے جادو ٹونے کا ثمر
ڈر جائے گی میری ماں
اب گھروں کو لوٹنا ٹھیک نہیں ہے

کئی سورج غروب ہو چکے ہیں
کئی خدا مر چکے ہیں
زندہ ماں کو دیکھ کر
اپنے یا اس کے بھوت پریت ہونے کا گمان گزرے گا

جب کوئی پرانا یار ملے گا
بہت یاد آئے گا اپنے اندر سے
دیر سے مر چکا پیار
رو پڑوں گا تو پھر یاد آئے گا

کہ آنسو تو میرے دوسرے کوٹ میں رکھے رہ گئے
جب چاچا ایسری
سر سہلائے گی آشیرواد سے میرا
کس طرح سے اسے بتاؤں گا میں کہ اس ذہن میں کس طرح کے خیال چھپے ہوئے ہیں

اپنی ہی لاش ڈھونڈتا آدمی
پتی کی تازہ چتا پر گوشت پکاتی پتنی
کوئی ہیملٹ کی ماں
سردیوں میں انسانوں کے جلتے جسموں کی آگ پر ہاتھ تاپتا خدا

جن آنکھوں سے دیکھے ہیں المیے
کس طرح ملاؤں گا وہ آنکھیں
میں بچپن کی تصویر کے ساتھ
اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ

شام کو جب چتا پر دیا جلے گا
گوردوارے پر شنکھ پھونکا جائے گا
وہ بہت یاد آئے گا
جو مر گیا ہے
وہ کہ جس کی موت کا
اس بھری نگری میں بس مجھے پتہ ہے

اگر اب کسی نے میرے من کی تلاشی لے لی
رہ جاؤں گا بہت اکیلا
کسی دشمن دیس کے جاسوس کی طرح
اب گھروں میں بسنا آسان نہیں ہے
ماتھے پر موت دستخط کر گئی ہے
چہرے پر پیار قدموں کے نشان چھوڑ گئے ہیں
آئینے میں سے کوئی اور جھانکتا ہے

چٹھیوں کا انتظار

اس نگری میں تیرا دل نہیں لگتا
کبھی طلوع ہوتا ہے، کبھی غروب

تجھے روز بھری دوپہر میں
چٹھیوں کا
انتظار رہتا ہے

ایک چٹھی آتی ہے دھوپ کی لکھی ہوئی
مہندی رنگے ورق کی طرف سے
تیرے آنگن میں بوٹا بن کر
اُگ آؤں اگر تو مان جائے

ایک چٹھی آتی ہے میری بہن کی
جدائی کی بانجھ رُت میں بھی
بھائی، میرے دروازے پر بھی
کسی نئے آنے والے کے لیے خیر مقدمی پھول بج گئے

ایک چٹھی آتی ہے جس میں ہوتا ہے
تیرے نام تاریخ کا پیغام
تیری تخلیق کی ستائش
تیرے فروغِ عظیم کا پیام

یہ سب چٹھیاں بالآخر آئیں گی
لوگ لکھ لکھ کر انھیں بھیجیں گے
چاہے یہ تیرے خط ہیں مگر
یہ کسی دوسرے گھر پہنچیں گے

لیکن تو امید نہ چھوڑنا کبھی
تیرے نام بھی چٹھی آئے گی
تیرا اپنا کوئی عزیز بھی آخر
چٹھیاں لکھ لکھ بھیجے گا

چٹھی آئے گی رات میں کسی وقت
چٹھی آئے گی امّی کی
بیٹا، یوں نہیں بھول جاتے
اس کوکھ کو جس سے تم نے جنم لیا ہو
کھڑے کھڑے میرا حال تو پوچھ جا
بوڑھی جان نکمّی کا
عمروں کی طرح کہیں انجام بھی ہوتا ہے
طویل اداسی کا

چٹھی آئے گی بڑی بے وقت
دھرتی سے لمبی چھاؤں کی چٹھی
چُپ کے صفحوں پر لکھی ہوئی
کسی اجڑی ہوئی سُونی سرائے کی چٹھی
ایک بے نقش خلا کی لکھی
تیرے اصلی نام کی چٹھی
لوگ کہیں گے یہ قبر کی چٹھی
تو کہے گا یہ تو ہے، ماں کا خط

چٹھی جب کُھلے گی
اس میں سے ایک ہاتھ اُبھرے گا
شام جیسا
تیرے پنجر میں سے کچھ ٹٹولے گا
بے چین بے رحم سا

تیرے اندر سے درد کی ٹیس اٹھے گی
کہرام سا مچ جائے گا
تیرے اندر سے پنچھی پرواز کر جائیں گے
یوں لگے گا جیسے آسمان بھر گیا ہے
جو کبھی نہیں اٹھا تھا
وہ بے نام سا درد اٹھے گا
مگر پھر تیری تپتی روح کو
کچھ آرام سا آجائے گا

اس کے بعد نہ تو کوئی نگری

نہ کوئی شام ہو گی، نہ ہی کوئی سویرا
نہ پھر چٹھیوں کا انتظار ہو گا
نہ تو نہ کوئی تیرا

اس نگری میں تیرا دل نہیں لگتا
کبھی طلوع، کبھی غروب
تجھے روز انتظار رہتا ہے
بھری دوپہر میں
چٹھیوں کا

سازندہ

اب جب وہ سازوں کی دکان کے پاس سے گزرتا ہے
تو سر جھکا لیتا ہے

یہ سب ساز اس کے گھر میں پڑے ہیں
کبھی وہ وقت تھا
جب وہ مینڈولن کے دام پوچھ کر وہاں سے نکلتا
تاروں کو جھنجھنا کر سوچتا تھا

ساز اس کا نہیں ہوتا جو اس کو خریدتا ہے
ساز اس کا ہوتا ہے
جو اس میں سے خوبصورت نغمے برآمد کرتا ہے

پھر ایک شام اس کے گھر بھی مینڈولن آگئی

کئی شامیں، کئی راتیں، کئی دن بیت گئے
ہارے ہوئے، شرمندہ الجھے ہوئے

جو دُھنیں اس کے ذہن میں تھیں
اس کو دستیاب نہ ہو سکیں

پھر اس نے سوچا
ہر ساز ہر سازندے کے قابل نہیں ہوتا
میرا ساز کوئی اور ہے

دوسرا ساز، تیسرا ساز، ساتواں ساز

اس نے کئی ساز بدلے
جو دُھنیں اس کے ذہن میں تھیں
وہ اس کے ہاتھ نہیں آئیں

اب وہ ساز اس کے خوابوں میں آکر
اس کو ڈراتے ہیں

وہ سارے ساز مل کر
بے سُر، ماتم جیسی آواز کرتے ہیں
ہمیں آزاد کردے۔۔۔ ہم تیرے نہیں ہیں

اس کی نیند کھل جاتی ہے
ساز چپ چاپ سو رہے ہوتے ہیں
چمکتے ہوئے ساز، کسے ہوئے ساز، اس کے اپنے
پھر بھی وہ کسی کے تار تک کو
ہاتھ نہیں لگاتا

وہ ڈرتا ہے اگر اس نے چھوا تو
تو غیر متحرک رات کے اندر
ساز بلند آواز میں چلّا اٹھے گا
چور کوئی چور۔۔۔ پرایا آدمی

اس کے ہاتھ گنہگاروں کی طرح کانپتے ہیں
کمینے ہاتھ۔۔۔ نکمے ہاتھ اٹھا کر
وہ من ہی من میں سازوں سے کہتا ہے
جو نغمے میرے ذہن میں ہیں
ظالمو! تم کیا جانو
تم تو مرئی ہو، وہ جو غیر مرئی ہے اسے تم کیا سمجھو گے

وہ بولتا جاتا ہے اور امّید کرتا ہے
کہ اس کی ان باتوں سے
کسی ساز میں لرزش پیدا ہو جائے گی
اور کوئی ماورائے لمس نغمہ گونج اٹھے گا

آخر کار وہ اپنے کانپتے ہاتھوں کو
سینے سے لگا کر لیٹ جاتا ہے

سینے کے اندر نغمے خوابیدہ ہیں
سینے کے اوپر ہاتھ
وہ اکثر سوچتا ہے
فرق تو تھوڑا سا ہے

خُدا

عجیب بھیانک رات تھی، دروازے کے قریب کھڑی
میرے گھر کے چراغ کے چہرے پر جھکی ہوئی
کبھی نہ ختم ہونے والی رات کے سائے کی طرح
جیسے آخری گھڑی

گھریلو نسخوں سے لے کر سرنج کی نوک تک
سرنج کی نوک سے لے کر، حدوں سے پرے خرابے تک
میری اداس نظر
جگہ جگہ بھٹکتی تھی

افق تک اندھیرے خلا کا پہرہ تھا
اور اس خلا کے اندھیرے کے ایک سرے پر
چتا کو خوف تھا
دوسرے سرے پر مدھم سا
ٹمٹماتا تھا میرے گھر میں میرے لہو کا چراغ
میرے جگر کا ٹکڑا
میری آنکھوں کا نور

چتا سے پرے تو فقط کچھ نہیں، کی ہنسی تھی
لیکن اس چراغ میں ایک کائنات روشن تھی
اور اس کے بجھنے کا خیال بھیانک تھا

میں اس چراغ کو اپنے سینے میں چھپاتا ہوں
ہوا سے اوٹ کے لیے پلکوں کو بند کرتا ہوں

جو ہے میں اس شے کی سلامتی کے لیے
جو کہیں ہے ہی نہیں اس کا سہارا لیتا ہوں
میں سمجھتا ہوں خدا انسان کی تخلیق ہے
یہ اس کے دل کی تسکین ہے، اس کا خواب ہے
مجھے اکثر معلوم ہوتا ہے کہ میں نے کیا کہا ہے
میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کی تشریح و تفسیر کیا ہے

لیکن اِس کہنے اور جاننے کے باوجود میں نے آج
اداس شام کی ساعت میں چراغوں کی قطار روشن کر دی ہے
اور جا رہا ہوں، میں ہتھیلیوں پر اپنے تھال لیے

کیا میرے ذہن سے میرا پڑھا ہوا فلسفہ بُجھ رہا ہے
رکتا ڈرتا چل رہا ہوں تاکہ کوئی واقف کار مجھے نہ دیکھ لے
میں ایک مزار کے پاس آ کھڑا ہوا ہوں

اچانک مجھے کسی کے رونے کی آواز سنائی دی

تڑپ کر، ہاتھوں سے گر کر جب چراغوں کا شیرازہ بکھر گیا
تو پہلی بار میرا خدا مر گیا

اور پھر کسی نے کہا
میں تیرے چراغوں کو مٹی سے اٹھا سکتا ہوں
میں انھیں دوبارہ روشن کر سکتا ہوں
کسی کنبے سے چاولوں کی ایک مٹھی لا
لیکن اس کنبے سے لا جہاں خوشی ہو
اور جس کے آنگن میں کبھی موت آ کر نہ کھڑی ہوئی ہو

بھٹکتا پھرتا تھا میں بہت دیر سے گلیوں میں
کہ اچانک میں نے دیکھا کہ یہ میرے ہی گھر کا دروازہ ہے
اور اس دروازے پر میری عورت
اپنے بازوؤں میں ہنستا ہوا ایک بچہ لیے کھڑی ہے

یہ دیکھتے ہی
میرا بجھا ہوا من جاگ اٹھا
بجھے چراغ جل اٹھے
اور جگمگانے لگے

مٹی سے ایک بار پھر میرا نیم جاں خدا اٹھا
میں اس کے بدن سے دھول بھی نہ جھاڑ سکا
میں ڈر رہا تھا کسی مانوس ہنسی سے

اے خدا اب غائب ہو جا
اپنی پرانی جگہ پر جا کر چھپ جا
یا آنکھوں کے راستے میرے لاشعور میں اتر جا
ہم پھر ملیں گے کبھی
خوف کے اندھیرے میں

گھر گھر

میں چھتری کے برابر کا گونجتا ہوا آکاش ہوں
ہوا کی سائیں سائیں کا پنجابی میں ترجمہ کرتا ہوں
عجیب و غریب درخت ہوں
طرح طرح کے ہزاروں حملوں سے چھلنی
چھوٹا سا بھیشم پتامہ
میں آپ کے سوالوں کا کیا جواب دوں

مہاتما بدھ اور گورو گوبند سنگھ
پرمود ھرما، اہنسا اور بے داغ چمکتی شمشیر سے
ملاقات کے مقام کے طور پر بہت غلط شہر ہوں

میرے لیے تو بیوی کی بانہوں کا گھیرا بھی کٹہرا ہے
کلاس روم کا لکچر اسٹینڈ بھی
اور چوراہے کی ریلنگ بھی
میں تمھارے سوالوں کا کیا جواب دوں

گھرر گھرر

مرے اندر نہرو بھی بولتا ہے اور ماؤ بھی
کرشن بھی بولتا ہے اور کامو بھی
وائس آف امریکہ بھی، بی بی سی بھی
میرے اندر بہت کچھ بولتا ہے
نہیں بولتا تو بس میں ہی نہیں بولتا

میں آٹھ بینڈ کا شکتی شالی دانشور
میری ناڑیوں کی گھرر گھرر شاید میری ہے
میری ہڈیوں کا درد و کرب شاید بنیادی ہے

میری تاریخ لمبی ہے اور برسوں پر پھیلی ہوئی ہے
لیکن کاغذوں میں بڑی مختصر

جب ماں کو لہو کی ضرورت تھی
میں کتاب بن گیا

جب باپ کو لاٹھی کی ضرورت تھی
میں بجلی کی لکیر کی طرح چمکا اور بولا:

کپل وستو کے شدودھن کا دھیان کرو
ماچھی واڑے کی جانب نظر کرو
گیتا پڑھی ہے تو غور بھی کرو
کرو کرمانی سنگم تلتوا لے
اور ایسا ہی اور بہت کچھ جو میری سمجھ سے باہر تھا

راہ میں روپوش دوست ملے
انھوں نے پوچھا:
ہمارے ساتھ صلیب تک چلو گے
قاتلوں کے قتل کو اہنسا سمجھو گے
گمنام پیڑ سے الٹا لٹک کر
مسیحی انداز میں
سرکنڈے کو بھاشن دو گے

جواب کے طور پر
میرے اندر اَن گنت تصویریں الجھ گئیں
میں کئی فلسفوں کا کولاژ بن گیا
اور آج کل کہتا پھرتا ہوں:
صحیح دشمن کی تلاش کرو
ہر ایک عالمگیر اورنگ زیب نہیں ہوتا

جنگل خشک ہو رہے ہیں
بنسری پر ملہار چھیڑو

بھوت پریت بندوقوں سے نہیں مرتے

میری ہر کویتا بھوت پریتوں کو مارنے کا منتر ہے
مثلاً وہ بھی
جس میں محبت کہتی ہے

میں حادثے میں گھری گاڑی کا اگلا اسٹیشن ہوں

میں ریگستان پر بنا ہوا اپل ہوں
میں مر چکے بچے کی تو تلی ہتھیلی پر
لمبی عمر کی ریکھا ہوں
میں مری ہوئی عورت کی ریکارڈ کی ہوئی
ہنستی ہوئی آواز ہوں
اب ہم کل ملیں گے

پُل

میں جن لوگوں کے لیے پُل بن گیا تھا
وہ جب میرے اوپر سے گزر کر جا رہے تھے
میں نے سنا وہ میرے بارے میں کہہ رہے تھے

وہ کہاں رہ گیا وہ خاموش سا شخص

شاید پیچھے مڑ گیا

ہمیں پہلے ہی معلوم تھا کہ اس میں دم خم نہیں ہے

میری دُھوپ

میری دُھوپ بیمار پڑی ہے
میرے سورج کو گھڑیوں نے کاٹ کر رکھ دیا ہے

دفتر کے دروازوں سے باہر
میری نظم میرا انتظار کرتی بوڑھی ہو گئی
اس بیچاری کے لمبے خوبصورت بال
کسی کے سہلائے بغیر ہی سفید ہو گئے

میں کرسی میں نصب ہو گیا ہوں
کرسی میں نصب بیٹوں کو اب صاحبزادے کون کہے گا

سرکس کا بوڑھا شیر ابھی آئے گا
میز پر بکھرے خواب کو کر دیکھ کر
سورجوں، پیڑوں، ندیوں کے سائے دیکھ کر
میز پر بچھی لمبی سڑکیں دیکھ کر برہم ہو جائے گا
اپنی قہر آلودہ نظروں سے
میرے خواب بھسم کر دے گا

مَیں آکاش، راہ گزار، مَیں جنگل
سمٹ کر ایک دراز میں بیٹھ جاؤں گا
زہر گھولوں گا، سانپ بن جاؤں گا
میں تو مور تھا، سانپ بن گیا ہوں
اب تو مجھے مورنیوں سے ڈر لگتا ہے
رنگ برنگے نوٹوں کی تتلیاں پکڑنے
لکڑی لوہے اور اندھیرے کے جنگل میں
سارے دوست گم ہو گئے ہیں
دیکھتے دیکھتے اپنا شہر پرایا ہو گیا ہے
کوِتا باہر بیمار پڑی ہے
میں ہوں اور ایک کورا شیشہ ہے
جو میری تاریخ سے واقف نہیں ہے

میں جس ریگ زار سے
دوستوں، قافلوں اور خوابوں کے ساتھ گزرا تھا
اس کو کچھ بھی یاد نہیں

جس ریت پر میرے قدموں کے نشان تھے
وہ ریت اب سروں پر چھا گئی ہے
ریزہ ریزہ وہ مرے نقوش پر گر رہی ہے

میں ریت میں رفتہ رفتہ گم ہو رہا ہوں
آخر ایک روز ریت میں دفن ہو جاؤں گا
ریگ زار میں دفن بیٹوں کو
صاحبزادے کون کہے گا

دو پیڑوں کی گفتگو

میری سُولی بناؤ گے
یار باب
جناب
کیا میں ایسے ہی کھڑا رہوں ساری عمر
کرتا رہوں پتوں پر موسموں کا حساب
جناب
کوئی جواب

مجھے کیا پتہ ، مجھے کیا علم
میں تو خود ہی آپ تیری طرح ایک پیڑ ہوں
تو ایسا کر
آج کا اخبار دیکھ

اخبار میں کچھ نہیں
جھڑے ہوئے پتے ہیں

اب ایک کتاب دیکھ

کتاب کے اندر بیج ہیں

تو پھر سوچ

سوچ میں کٹاؤ ہیں
دانتوں کے نشان ہیں

راہ رووں کے پاؤں کے نقوش ہیں
یا میرے ناخنوں کی لگائی ہوئی وہ خراشیں
جو میں نے بچنے کے لیے
دھرتی کے سینے پر لگائی تھیں

سوچ سوچ کچھ اور سوچ

سوچ کے اندر 'قید' ہے
سوچ کے اندر خوف ہے
ایسا لگتا ہے میں دھرتی کے ساتھ بندھا ہوا ہوں

جا، جا کر ٹوٹ جا

ٹوٹ کر کیا ہو گا
پیڑ نہیں تو پیڑ کی راکھ سہی
ریت نہیں تو بھاپ سہی

اچھا اب چپ ہو جا

میں کب بولتا ہوں
یہ تو میرے پتے ہیں
ہوائیں ڈولتے

دیواروں کی زبان

میں اپنے دیس سے دور، جلاوطن ایک سایہ بول رہا ہوں
میرے دل میں ایک گمان جیسا بھروسہ ہے
کہ دور کہیں تو بھی میری آواز سن رہا ہے
تو جس نے بڑوں کے کہے کو سچ مانا ہے
اور مجھ پر حاوی ہو کر اپنی طرف سے مجھے نذرِ آتش کر کے
کئی برس پہلے میرا کام تمام کر چکا ہے

لیکن میں اس پیار کے طفیل
جو سفاک جلادوں کے دل میں
قتل کے بعد جاگتا ہے
کسی نہ کسی طرح آج تک مشکل سے سانس لے رہا ہوں

ذرا دیکھ میں تیری آنکھ میں
وہ آنسو بن کر ڈول رہا ہوں جس پر ایک نام لکھا ہوا ہے

اگر سننے والے پوتر ہوتے

پھر تو پتھروں کا بھی دل کرتا کچھ کہیں
دیواروں کے کان بھی چاہتے
وہ بھی زبان کے روپ میں جنم لیں

لیکن اگر دیواروں کے بھی کان رہیں
تو زبان کو بھی اچھا لگے

اگر دیوار تاریخ رقم کرے
تو پھر کئی پاپڑ بیلنے پڑیں گے

بدلنا ہو گا بہت کچھ
شرمسار، سر جھکائے کٹہرے میں کھڑے ہوں گے
شہنشاہ، راجے، منصف
اور آسیب کے روپ میں بھٹکیں گے
سورگ کے نواسی
ہر شاہی دستار پر لگا ہوا خون
رنگ برنگا دکھائی دے گا
دیواروں کے بھی کان رہیں اور زبان کو بھی ناگوار نہ گزرے
خطرناک ثابت ہو گا
دیواروں کا کچھ کہنا
اگر دیواریں بول پڑیں
تو سننے والا کوئی پوتر نہیں رہے گا

میں دیواروں کی زبان جیسا
چپ ہو جاتا ہوں

اندھیرے میں سلگتے حروف

شام کی دعا کو زوال آلودہ کہانی سنا کر
کھوج رہا ہوں سروں میں
بجھی چتاؤں کی راکھ

سر پر آسیب زدہ ہوا
پتہ نہیں میں کون ہوں، کوئی بھوت پریت
ہنستے بستے شہر میں ماتم گھول رہا ہوں

میں اپنے دیس سے دور، جلاوطن، ایک سایہ بول رہا ہوں

گھڑی

سفر سے محروم، طواف کرتی ہے
اپنی عمر عجیب گھڑی ہے
اسے کہیں نہیں پہنچنا
اس نے ایسے ہی تیز رفتار اختیار کر لی ہے

گھر، دفتر، تنخواہ، ترقی
روٹی، سروس، کچی، پکی
چھٹیاں، تاریں اور اخباریں
چھوٹی چھوٹی کامرانیاں اور ناکامیابیاں
ایک دور، گیارہ بارہ کے مقام
یہ ہیں گھڑی کے ہندسے

بار بار انھیں مقامات کا طواف کرتی ہے
اس کے علاوہ اور کوئی سفر نہیں اس کا
یہ بس اپنا معمول نبھا رہی ہے

مرنے والوں نے اسے ایک راہ پر ڈال دیا ہے
بھوت پریتوں نے خوب بنایا ہے اس کا ڈائل

ایک دن ایسے ہی چلتے چلتے
گھس گھس کر اس کی دھجیاں، پُرزے، چیتھڑے اڑ جائیں گے
اپنے ہی دندانوں میں اٹک کر رہ جائے گی

آس، طمع کی چابی ہوتے ہوئے بھی
ایک ہندسے پر
یا کچھ ہندسوں کے درمیان
رک جائے گی

اچھا ہے اس کو نجات مل جائے گی
نہ جانے کس مہم پر گامزن ہے اب بھی وہ
سفر سے محروم، طواف کرتی ہے
اسے کہیں نہیں پہنچنا
اس نے ایسے ہی تیز رفتار اختیار کر لی ہے

جب بُت بن جاتا ہے

نہ دار و رسن نہ پیالہ زہر کا
ہر بشر بے قصور تیرے شہر کا
میں کیا نام دوں اپنے دل کے زہر کو
کیا کروں درد کی اس لہر کا
جس کے آگے کچھ نہیں ٹھہرتا
نہ تو تیرے سانسوں کی گنتی کا بھروسہ
نہ تیرے تھک جانے کی بات
او رہی سوچوں میں من ڈوبا ہوا
جیسے تو مرا نہیں
تجھے کسی نے قتل کیا ہے

چاہے کسی احساس نے یا وسواس نے
تجھے بہرحال کسی نے قتل کیا ہے

کل تو اس شہر کا سنگار بن کر
سنگِ مرمر کا بُت شہر کے چوراہے پر ایستادہ

شہر کے باشندوں کی
قدر دانی اور پیار
کی تاریخ بن کر
مسکراتا جائے گا

ہر کھلے یا مایوس چہرے پر
ہر مظاہرے اور ہر جلوس
ہر شبِ سیاہ اور طلوعِ مہتاب پر
اپاہجوں اور نابیناؤں پر
ہر حادثے پر، ہر خوشگوار ملاقات پر
ہر بد چلنی پر، ہر اچھے اخلاق پر
ٹکر ٹکر دیکھے گا
بس مسکرائے گا
بُت کو غصہ کبھی نہیں آئے گا

اب تو تیرے قاتلوں کو بھی تیرے اس بُت پر
بہت پیار آئے گا
کیونکہ ہر منظر پر بُت مسکرائے گا
بُت کی آنکھوں سے آنسو کبھی نہیں چھلکیں گے
بُت کو غصہ کبھی نہیں آئے گا

چوک شہیداں میں اس کی آخری تقریر

چلو یارو! اب اس چوک کو چھوڑ دیں
کہ اب یہ چوک چوراہا نہیں رہا

جب خاندان سلامت تھے تو یہ چوک، چوک شہیداں تھا
جب بنیادوں میں پتھر چنے جاتے تھے
تبھی نہیں
جب گھنا اندھیرا تھا
اور کوئی اتا پتا نہیں ملتا تھا
اندھیرے میں کس طرف سے تیر آتا ہے
کس کا تیر آتا ہے
اور کوئی اپنا پرایا لڑھک جاتا ہے
ہر ایک تیر پر مقدر رقم تھا
اور انگلیوں کے نشان پڑھنا کسی کو نہیں آتا تھا
اس وقت یہ چوک چوراہا ہی ہوتا تھا

اس وقت اگر آپ بُت بن کر اس جگہ

عمر بھر سوچتے رہتے
کہ کس طرف جائیں
تو قابلِ پرستش ہوتے

یا جس راہ سیانے چل پڑتے
ایک جیسے ہی معصوم ہوتے

اب معصومیت کیا ہے
سائڈ پوز اصیل کبوتر کا
یا بت کی دستاویزی مسکراہٹ ہے
شہر کو چور لوری سنا رہے ہیں
چھلاوہ پھول بن گیا ہے
یا لومڑ کو انتخابی نشان کے طور پر مینا مل گیا ہے

اب معصومیت کیا رہ گئی ہے
اب تو پتہ ہے جنڈ کے پیڑ پر ترکش
صاحباں نے نہیں، وقت نے ٹانگا تھا
اب تو پتہ ہے کہ اگر کنگن کنجی ہو
تو ہوا کے بھی ہاتھ اگ آتے ہیں
اب تو پتہ ہے کہ روح بھی گوشت کھاتی ہے
اب تو پتہ ہے کہ شگنوں بھری رات میں
کس نے قتل کیے دودھ پوت
اور قاتل کے پاؤں کے نشان کس طرف جاتے ہیں
اب چوک چوراہا نہیں

چلیے اس چوک کو چھوڑ دیں اور
کسی چوراہے پر پہنچیں
اور وہاں پہنچ کر پھر الجھن میں پڑ جائیں
یہاں الجھن میں پڑنا ایک بار کوکھ میں جانے کے برابر ہے
آپ کو کیا بتاؤں میرے بیش قیمت دوستو!
آپ تو جانتے ہو
کہ جس چوک کے اندر
اپنے حساس، ہنس مکھ دوستوں کا لہو بکھر جائے
تو وہ چوک چوراہا نہیں رہتا

جن چوکوں پر ابھی رفیقوں کا لہو بہنا باقی ہے
وہ آگے ہیں۔

کبھی نہیں سوچا تھا

ایسے تو میں بھی
سورج وادی
سندھیا مکھی کوی ہوں
ایسے تو مجھے بھی بہت اچھی لگتی ہے
کمرے کی مدھم روشنی میں

ایل۔ پی سے آتی
اداس پانی کے بھنور کی طرح چلتے
یمن کلیاں کی دُھن

ایسے تو مجھے بھی بہت اچھا لگتا ہے
شبدوں اور ارتھوں کی چابیوں سے
کبھی برہمانڈ کو بند کر دینا
کبھی کھول دینا
کلاس روم میں بُدھ کے اہنسا کے احساس کو
سفید کبوتر کی طرح سہلانا

سفیدے کے پیڑوں جیسے حسن پر
بادل کی طرح بوند بوند برسنا

ویسے تو مجھے بھی بہت اچھا لگتا ہے
آسمان پر ستاروں کو جوڑ جوڑ کر
تیرا اور اپنا نام لکھنا

پر جب کبھی اچانک
بندوق کی نالی سے نکلتی آگ سے
پڑھنے گئے طالب علموں کے سینے پر
ان کا مستقبل لکھا جاتا ہے
یا گہری بوئی جاتی بندوق کی گولیاں
یا سکھایا جاتا ہے ایسا سبق
کہ گھر جا کر ماں کو سنا بھی نہ سکیں
تو پھر میرا جی چاہتا ہے
جنگل میں چھپے گوریلے کو کہوں:

یہ لے میری نظمیں
جلا کے آگ تاپ لے

اسی لمحے اس کی بندوق کی نالی میں سے
نکلتی آواز کو
خوبصورت شعر کی طرح بار بار سننے کو جی چاہتا ہے
تشدد بھی ایسا شاعرانہ ہو سکتا ہے
میں نے کبھی نہیں سوچا تھا

سفید کبوتر لہو لہان
میرے ان سفید کاغذوں پر گر پڑتا ہے
جن پر میں تمھارے نام خط لکھنے بیٹھا تھا

خط یوں بھی لکھے جائیں گے
میں نے کبھی نہیں سوچا تھا

ساز

اس نے کوئی اور ہی ساز بجایا

محفل کے ایک کونے سے جیسے
تانبے کے رنگ کا تمتماتا، جگمگاتا سا
سورج طلوع ہو گیا

دھند میں لپٹے پربت
سائیں سائیں کرتے بہتے پانی
سیمگوں صحرا
دکھائی دینے لگے
اس نے کوئی اور ہی ساز بجایا

گھرر گھرر نجوم گردش میں ہیں
پہیے گھوم رہے ہیں
دندانے گھوم رہے ہیں
لاکھوں کروڑوں گراریاں گھوم رہی ہیں

پاگل خانہ شور بن رہا ہے
لوگوں کا جنگل اُن کی آہ وزاری
ہجوم در ہجوم کیڑے مکوڑے اپنے کام میں مصروف ہیں

لاکھوں کروڑوں پیروں والے گھوڑے کے خونی جبڑوں میں اس نے اپنی
آواز کو لگام کی طرح ڈال دیا

اس نے اور ہی ساز بجایا

وہ دن

وہ دن اگر کہیں مل جائے
میں اس کے سفید ہنس جیسے جسم پر
مرہم لگا دوں

لیکن دن گھر سے روٹھ کے جانے والے کسی شخص جیسا نہیں
جس کا کبھی کہیں سراغ ملے
اور پھر کسی شام
وہ پھٹے حال گھر لوٹ آئے
یا کسی اسٹیشن پر گاڑی کے انتظار میں کھڑا مل جائے

دن گھر سے روٹھ کے جانے والا کوئی شخص تو نہیں
دن تو ہمارے ہاتھوں مارے گئے لوگوں
کے کراہتے بھوت ہیں
جن کے زخموں تک اب ہمارے ہاتھ نہیں پہنچتے

جو اب بیتی ہے کل تک
صدیوں تک پہنچتی آج کی چیخ

نئے دیوتا

زخمی اناوالے، ہارے ہوئے آدمی
سلگتے ذہن والے میرے جیسے دوست!

ایسا لگتا ہے کہ رُوح شدید حرارت کی زد میں ہے
شام ہے اور دل میں بڑی اداسی ہے
ہندسے ماتم گسار ہیں اور من کی گھڑی ساکت ہے

آج جیسی بُری شام جب بھی آتی ہے
جب بھی شکِستوں کا احساس گھیرے میں لے لیتا ہے
وُجود اپنا جب بھی ندامت بن جاتا ہے
تو بڑا ستاتا ہے
اپنے جعلی پن، اپنے کھوٹ کا ہی کوئی کمینہ خیال
کہ کسی دیوتا کی پرستش کرو

مور پنکھوں پر بیٹھی سرسوتی نہیں
گنگا لہری جٹا جوٹ شوجی بھی نہیں
شو کے نندی پر سوار پاروتی نہیں

سات گوؤں کو ہانکتی اوشا بھی نہیں
کسی کوکھ سے اُگتا کنول بھی نہیں
اور کنول پر جلوہ افروز اُما بھی نہیں

یہ میرے ہم حال نہیں، ہر گز نہیں
اس طرح کا کوئی دیوتا
ہم جیسے ذہنوں کے کام کا نہیں
ہمارے اپنے الگ اور نئے دکھ ہیں
ہمارے اپنے الگ اور نئے دیوتا ہیں

شکست کسی اور کی
شامت کسی اور کی
یا بے ادبی کسی 'خوب' کہلاتے ہنر مند کی
یا بے حرمتی کسی بڑے اداکار کی
اس کی انا میں سے رستا لہو
یہ ہیں میرے نئے دیوتا

اگر ان کی پرستش کرنے سے ایک بار پھر زندہ ہو جاؤ
تو تپتے ذہن پر رم جھم ہو جائے گی
سلگتی روح کو سکون مل جائے گا
زخمی انا کو مرہم نصیب ہو جائے گا
بجھے دل کو روشنی مل جائے گی

ہمارے اپنے الگ اور نئے دکھ ہیں
ہمارے اپنے نئے دیوتا ہیں

مور پنکھوں پر بیٹھی سرسوتی نہیں
گنگالہری، جٹاجوٹ شوجی بھی نہیں
سات گوؤں کو ہانکتی اوشا بھی نہیں
کسی کوکھ سے اُگتا کنول بھی نہیں
اور کنول پر جلوہ افروز اُما بھی نہیں

باپ کی دعا

ہے پر بھو، وہ دروازہ کب کھلے گا
جہاں پر پوداخود ساز ہے
اور خود ہی سازندہ ہے

رات پتا، اس دوار کے قریب
تھک ہار کر بیٹھ گئے
ہونٹوں کے سارے بول ختم ہو گئے
ہونٹ پھڑ پھڑاتے رہ گئے

ساگر میں کب ضم ہونا ہے
وجود کا آنسو کھارا

پون کے سمندروں کو آزاد کر
میری سانسوں کے لیے دروازے
جسم در جسم خاک میں مل کر
کھل اٹھیں سرخ شگوفے

گدلا پانی جل کر
بوندوں کی طرح کنوارا ہو جائے

اب ہاتھوں سے نہ پلنگ بنانے ہیں
نہ رنگین پالنے
نہ وہ تختیاں جن پر
بچوں نے پہلے پہلے حروف لکھے

اب تو اپنا جسم پیڑ ہے
اور سانسوں کا آرہ

ایک جنگل ہے جس کا ہر ایک
پیڑ میت ڈھونے کے لیے بنا ہے
ہر پودے پر نام کسی کا
ہر شخص کے لیے ایک پودا مخصوص ہے

اس جنگل میں چلتا رہا
ساری رات کلہاڑا

پربھو جی وہ دروازہ کب کھلے گا
جہاں پر پودا خود ساز ہے
اور خود ہی سازندہ

ہر بار اپنے ہی آنسو
آنکھوں میں نہیں آتے
کبھی کبھی ہمارے اجداد بھی
ہماری آنکھوں سے روتے ہیں

سازنواز

زخمی ہوئے، ساز بجانے والے باپ کا
ساز گر گیا

ایک ہرا بھرا درخت
پہلے ہی لمحے میں سوکھ گیا
دوسرے پل جل گیا
تیسرے پل راکھ بن گیا
چوتھے پل پھول بنا
اور پانچویں پل پھول پانی پر تیر گئے

باپ جو ایک پُر تمازت وجود تھا
وجود سے مٹی
مٹی سے آگ
اور آگ سے پانی ہو گیا

میں نے اسے دور تک جاتے دیکھا
بہتے پانی باپ کو

باپ اب کہیں نہیں تھا
میں ماں کے کلیجے سے لگ گیا

نہیں میں رو نہیں رہا
یہ میری آنکھوں میں آنسو
یہ تو جلتی سلگتی دو کونپلیں ہیں
یہ تو دو شبد ہیں پانی کے
موہ بھرے باپ کے لیے۔۔با۔۔۔پ

ماں نے مجھے اپنی بانہوں میں سمیٹا ہوا ہے
جس طرح دھرتی نے پودے کی جڑوں کو
اپنے اندر سمویا ہوتا ہے

ماں چُپ ہے
کنویں
رفتہ رفتہ کٹتے کنارے کی طرح
بہتی ندی کی طرح چپ
دھرتی کی طرح چپ
دھرتی جو پیڑ سے پھوٹتی پتّیوں کو دیکھ کر
اس کی جڑوں سے باتیں کرتی ہے

باپ مجھے تصویر سے دیکھتا ہے
بس تو پھول کی طرح کھلا رہے
پھول توڑ کر میری تصویر کے گرد

ہار نہ پہنایا کر
مجھے پھولوں کی مرجھائی ہوئی مالا
اچھی نہیں لگتی

باپ کی آنکھوں میں لامحدود شفقت ہے
اور ایک تڑپ بھی
کہ وہ اب میرے ساتھ
صرف خاموش گفتگو کر سکتا ہے
مجھے بازوؤں میں لے کر
بھینچ نہیں سکتا

لیکن باپ، وہ ہتیارے

میں جانتا ہوں
قاتل کون تھے
لیکن تو میرا بیٹا ہے
سازنواز کا
ساز اٹھا
میں ابد تک جینا چاہتا ہوں

گیارہ ہزار راتیں

تیری دیوار پر آویزاں گھڑی
میرا سورج نہیں
نہ ہی تیرے کمرے کی چھت میرا آسمان

اور میں صرف یہی نہیں

جو تیرے سامنے ہے ایک وجود

تو نہیں جانتا
میں اکیلا نہیں

اس دروازے سے باہر کھڑی ہیں
اداس پشتوں کے خون پر پلی ہوئی
میری گیارہ ہزار زہر بھری راتین

خونخوار جابر شبہیں

میرا سیاہ لشکر

میری تاریخ کی برہمی

اداس دن

آج بڑا اداس دن ہے
اور اس سے بھی بڑھ کر اداس دن دہلیز سے باہر کھڑا ہے
اور اس کے پیچھے اس سے بھی زیادہ اداس دن

اداس دنوں کی قطار ہے دور تک
اداس دنوں کا لشکر
اور میری آنکھوں میں صرف نمی

دوستو!
ہم سب ابھی کہیں نہ کہیں زندہ ہیں
لیکن بہت دن پہلے ہماری دوستی کی موت ہو گئی تھی
جب ہم ڈیرے سے وداع ہوئے
تو چوک میں ایک روتی بلکتی چیز چھوڑ گئے تھے
شاید وہ دوستی ہی تھی

ہمیں ہمارے گھروں نے بلا لیا تھا
ڈیرے کے مرشد کے پاس ہمارے گھر والے

ہمیں چھوڑ کر بھی اس لیے گئے تھے
کہ ہمیں منشی جی اچھی طرح سزا دیں
اور ہمیں کچھ بنا دیں
نوٹوں کے پودوں کی گوڈائی کرنے والی کدالی
یا گرتے گھر کی ستونی
بڑھاپے کی لاٹھی ۔ اور کیا تھا
اس طرح چمکا دو میرے لال کو چوری چوری
کہ رقیبوں کی آنکھیں چندھیا جائیں

ماسٹر جی کی بھی یہی تعلیم تھی
اور ہمارے لہو کے اندر
ماں کی چھاتیوں کی خاموش لوری نے بھی
شاید یہی کچھ لکھا تھا

ہم اپنے اپنے گھروں میں پہنچ گئے

کسی کسی رات یوں لگتا ہے
ہمارے گھر چھوٹے بڑے سمندری جہازوں کی طرح
خوف کے سمندر میں تیرتے ہیں
اور جب کوئی جہاز ڈوبتا ہے
تو لوگ کھڑکیوں سے جھانکتے ڈرتے نہیں
شکر کرتے ہیں
کہ جو جہاز ڈوب گیا
وہ ان کا نہیں تھا

ڈاکٹر بیمار موسم کا انتظار کرتے ہیں
منصف قتل کی ترغیب دیتے ہیں
اور قوم کے معمار خونخوار دریاؤں کے پلوں کی
پختگی اپنے گھر لے جاتے ہیں

کوئی آواز اٹھاتا ہے
تو کسی رات
اپنے آپ کو
قابلِ تعظیم قدموں میں پاتا ہے

پاؤں جو اس کی آواز کو
خوب اذیت پہنچاتے ہیں
اور اس کی نیم بیہوشی میں
لوٹ کا مال آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں
آپ کہیں گے:
"شاعر! تو اداس ہے
تیری اداسی کچھ بھی نہیں
ایسے ہی بچا کھچا آدرش واد ہے
کسی مرے ہوئے ارادے کی
آہستہ آہستہ دم توڑتی یاد ہے
ہاں! دستور رفتہ رفتہ مر رہا ہے
بہت کچھ"

مر رہا ہے، چپ چاپ
ایک دوسرے کا آسرا

صحیح بات کے لیے کھڑا ہونے کا حوصلہ
زندہ رہنے کا رتھ
تو دور کی بات ہے
زندہ رہنے کا شوق ہی دم توڑ رہا ہے

میں نہیں مانگتا آپ سے
قائد اور شہید کی عظیم قربانی
میں چاہتا ہوں
ادھورے سے جملے، اٹھے ہوئے ہاتھ
چھوٹے چھوٹے کروڑوں قدم

اداس دنوں کی فوج کا منہ موڑنے کے لیے
میں مانگتا ہوں آپ کے دلوں میں چھپی
بچی کھچی
دوستی کا آسرا
اپنی یگانگت کی یاد
آپ کہہ لیجئے اس کو کوئی بھی فلسفہ کوئی بھی واد

اس ہاتھ سے کانٹے اگے ہیں
بچ کر رہنا

لیکن یہ مت بھولنا
کہ کانٹے اس ہاتھ کو چھید کر اُگے ہیں

فرق

جب ہم چھوٹے تھے
ایک باغ میں بہت سے پھول تھے
ہم دو تھے

لیکن جب ہم بڑے ہو گئے
باغ ایک تھا
ہم دو تھے

موت

ہمارے سامنے وہ آگیا اور مار گیا
اور ہم جیتے رہے کچھ اس طرح
جیسے ہم زندہ نہ تھے

ایک احساس

اِس طرف ڈوبتا سورج ہے
اُس طرف جھڑتے پتّے ہیں
اِس طرف مضطرب دریا ہے
اُدھر سونی پگڈنڈی ہے

میرے چاروں طرف
یہ آئینے کیوں لٹکا دیے گئے

ایک ندی.....

ایک ندی آئی
رشی کے پاس
سمت مانگنے کے لیے

اس ندی کو رشی
کی تشنگی نے پی لیا

آئینے کی بھری دوپہر

ایک بدصورت لڑکی
سلگ رہی ہے آئینے کی بھری دوپہر میں
بے سود تلاش کر رہی ہے
آئینے کے ریگ زاروں میں دل کا کنول

اس سے آگے

اس سے آگے تو برہنہ جھیلیں ہیں
دودھ کے بتوں پر چڑھتی ہے قہر کفر بہار

ایسی بادِ خزاں جلتی ہے
جس کے لیے جسم کے پیرہن صرف پتّے ہیں

اس قدر جذباتی نہ ہو ناٹک میں
کہ خودکشی کے لیے کہیں سچ مچ کا زہر پی بیٹھے

موہ اور ممتا کا مذاق بہت ہو چکا، اسے چھوڑ پرے
شام ڈھلتی ہے آ جامڑ چلیں

اس سے آگے ہنس پون چل رہی ہے
دودھ سے پانی بچھڑ کر روتا ہے

اس سے آگے تو ایسا عالم ہے

ہر کوئی اپنے اصلی قالب میں ڈھل گیا ہے

تو اگر پانی میں پاؤں ڈالے گی
پل بھر میں مچھلی کا روپ اختیار کرلے گی
میں اگر پانی میں پاؤں ڈالوں گا
پل بھر میں پانی کا بہاؤ بن جاؤں گا

اس سے پہلے کہ تیری گہرائی کا بھید کھلے
اس سے پہلے کہ میرا عکس دکھائی دے
آ جا پانی کو گدلا کر دیں
شام ڈھلتی ہے آ جا لوٹ چلیں

اس سے آگے تو اجداد کے آسیب
ہوائیں بن کر جنگلوں میں بین کرتے ہیں

اس سے آگے تو ہر قدم تلے
ماں کی لوری کا ٹکڑا آ جائے گا

اس سے آگے تو آدمی سے
اس کی پوشاک
اس کا نام
اس کی یاد ۔ خیر باد کہتے ہیں
انسان یوں، پانی کا قالب اختیار کرلیتا ہے

مجھے اس نام سے محروم عالم کی بیکرانی سے خوف آتا ہے
مجھے اپنے گھروں کی حد کی جانب سے
نام لے کر کوئی بلاتا ہے

کوکھ کہتی ہے

چپ کی دھوپ میں کیوں جل رہا ہے
آ شبدوں کی چھاؤں میں آ جا
روحوں کے خلا میں کیوں دھنکا جا رہا ہے

پردیس کی شاموں میں
شمشانوں کے پاس
اجداد میں سے کسی کی
یا کسی ان جمے وارث کی
آواز تجھے پکارے گی

آواز تو سگی ہو گی، نیّت اجنبی، غیر

یہ بے لب بول سن کر
ان سنا کر دینا
نہیں تو بے لب بول
تیری انتڑیوں میں

گھونسلہ بنانے کے لیے ترپیں گے

آگے نہ بڑھنا

اس شہر کی راہ گزر پر
ایک وہ ندی بھی آتی ہے
کہ جس پر اپنے آپ کے علاوہ کوئی پل نہیں ہوتا
اور اپنی لاش کے علاوہ کوئی کشتی نہیں ملتی

جو تیرے سارے پنچھیوں کے لیے جنگل
تیری ساری مچھلیوں کے لیے
پانی ہو سکتا تھا
میں نے مانا میں وہ نہیں ہوں

میں نے مانا میں مکتی کا وہ دروازہ نہیں ہوں
جس سے گزر کر
تیری کچھ سانسوں کو مکتی مل جائے گی
باقی ماندہ سانسوں کو ناگہانی موت
اور جاری رہے گا سلسلہ آواگون کا

پی جائے جو تیرے وجود کے سارے دکھ کو
میں نے مانا میں وہ شبد تو نہیں ہوں

پھر بھی
ممکن ہے تیرا دکھ سہنے کے لیے

کو کھ کہتی ہے

یا اپنا خالی پن بھرنے کے لیے
کہتی ہوں:

چپ کی دھوپ میں تو کیوں بھٹکتا ہے
آ، شبدوں کی چھاؤں میں آجا
روحوں کے خلا میں کیوں دھنکا جا رہا ہے
جسموں کے جنگل کی جانب اس راستے سے آجاتا

وہ

وہ تو میری ادھیڑ عمر شاخوں کے خوفناک اندھیروں کے درمیاں
ایک ناجائز خواب کا بے بنیاد گھونسلہ ہے

میری درویشانہ پیشانی پر رقاصہ کے پاؤں ایک نکتے جیسا نقش ہیں

وہ ایک سلگتا ہوا چاند ہے، میری انجام سے محروم جامنی رات کا

وہ میرے ادھیڑ عمر مہذب سینے میں
چھپ چھپ کر دہکتی غیر مہذب، کثیف آگ ہے

اس کا نام ایک ایسا شبد ہے جو سفید سنگ مرمر کے تپتے مینار پر
دن رات برفاب کی طرح قطرہ قطرہ گرتا ہے

وہ میرے سنسار میں بہتی ہوئی ایک اکیلی ندی ہے
جو میرے سوا کسی اور کو دکھائی نہیں دیتی

وہ

وہ ایک عورت روپی مندر ہے میرے ویرانوں میں

وہ ایک برہنہ بُت ہے برسات میں بھیگتا دن رات

وہ کالی رات میں دہکتی آسمانی آگ ہے

وہ زیرِ زمین ایک لو ہے

وہ پیرہنوں تلے مستور ایک یگوں لمبی پراسرار کتھا ہے

اس کا چہرہ جھلمل کرتی کائنات ہے

اس کے نینوں میں برہمانڈ کا سارا حسن دکھائی دیتا ہے

وہ دنیا کا سب سے حسین ساز ہے

اس کے مضراب کے لمس سے ہوا کے ان دیکھے تار جھنجھنانے لگتے ہیں
کرنوں کا بنا ہوا ساز بج اٹھتا ہے

لیکن وہ ادھیڑ عمر مہذب سینے میں
چھپ چھپ کر دہکتی فحش آگ ہے

میں چھونے لگا تجھے

میں چھونے لگا تجھے

بڑا واویلا مچا

اندھیرے تڑپ اٹھے

سو شنکھ ناد بلک اٹھے

گھڑیال بج اٹھے

چولہوں میں سے لپٹیں اٹھیں

ماؤں

بیویوں

بہنوں

کے سینوں میں سلگنے لگیں

ایک عورت بال کھولے

چلائی اور دوڑ پڑی

اس کے قہر سے کانپ اٹھے

سارے دیوتاؤں کے پتھر
اور راجاؤں کے تاج

پیر، فقیر برہم ہوا ٹھے
اور میرے چیلے ہنس دیے مجھ پر

میں نے اپنا ہاتھ تیرے تاروں سے دور کر لیا
سازِ طرب سے ہٹالیا
میں نے ہونٹ دور کر لیے
رادھا کو موہت کرنے والی مدھر بانسری سے
ڈر گیا میں رکمنی سے، اس کی
خاموش گریہ زاری سے
ایک صاف شفاف اجلا ورق
میرے قریب آیا

میرے اوپر کچھ بھی لکھ دے
نیکی بدی کی کوئی تازہ نشان دہی کر دے
قدرت اور تہذیب میں ایک اور عہد نامہ
تو اپنی آرزو جیسا نیا اپنشد تخلیق کر دے

میرے اوپر کچھ بھی لکھ دے
تو آپ خود آزاد ہو جا
اور اس کو بھی آزاد کر دے

تو اگر خود پانی بن جائے

اس کے سینے میں مرگ آسا آگ سلگتی رہے
یہ تو صحیح نہیں ہے نا!

ایک صاف شفّاف اجلا ورق
میرے قریب آیا
اور میں لکھنے سے ڈر گیا

خود کلامی

رادھاناراض
رکمنی اداس
اور کرشن پریشان

کرشن جو ہر فن مولا اوتار نہیں ہے
ادھیڑ عمر کا شاعر ہے
جس کے بالوں میں دھوپ اور چھاؤں کی بحث چل رہی ہے
ہونٹوں پر بانسری نہیں
بے جان سی خاموشی ہے
اور سینے میں رادھا اور رکمنی کے مکالمے
جو انھوں نے ادا نہیں کیے

لیکن شاعر ٹھہر!
ان کہے کو کہا کرنا
اس کا وردان بھی ہے اور شراپ بھی

اگر تو نے اس طرح ہی لوٹ جانا تھا۔ کرشن!
تو تو آیا کیوں؟
رادھا کہتی ہے
کس نے رکھا تھا تیرا نام کرشن
اے تذبذب کے اوتار
تو کیا دے گا کسی ارجن کو گیتا کا اپدیش
تو تو خود پھینک دے گا
جنگ کے درمیان
تیر کمان
اے بنسی دھر
تو بانسری نواز نہیں ہے
تو بانسری کے سروں سے
صرف اس کو ایندھن بنا سکتا ہے
اپنے عذاب کی آگ کا ایندھن

لیکن جا
میں تجھے تیری تپش کے نام پر
معاف کرتی ہوں

'میرے سابقہ پربھو'
شاعر کے من منچ پر
رکمنی نے کہا:
اٹھا لے مٹی میں گرا اپنا نورانی ہالہ
اور اپنی ہوس کی بانسری

اگنی جو ہمارے پوتّر بندھن کی شاہد تھی
وہ اب کہیں باہر نہیں
میرے اندر جل رہی ہے

تو لوٹ آیا ہے
لیکن میرے سینے میں سلگ رہی ہے
تیرے چور قدموں کے جانے کی آواز

یہ کوئی حساب کا سوال نہیں میرے پربھو!
کہ میں تیرے جاتے قدموں کی چاپ میں سے
تیرے لوٹ آنے کی چاپ منہا کر دوں
اور جو کچھ ہو چکا ہے
وہ صفر ہو جائے
تیرے من میں جو شنکھ ناد، بلکنے لگے ہیں
منڈپ کی آگ جو تیرے دل میں کچھ کچھ سلگ اٹھی ہے
اس اگنی کے نام پر
میں تمھیں معاف تو کر سکتی ہوں
لیکن تمھاری بانہوں میں بے فکر ہو کر سو نہیں سکتی
اور تو بھی بے فکر ہو کر مت سونا پربھو!

یہ جو سلگتی عبارت جیسا
میرے من میں آیا ہے
یہ مجھے تیری بانسری نے ہی سکھایا ہے

نمسکار

اس کو دیکھ کر
وہ جو تیرے سینے میں سے
پھول کھلا تھا
مجھ سے برداشت نہیں ہوا

میں اس پھول کو منع کرنے لگا
تو میرے سینے کے اندر سے ہی آواز آئی

اے میرے من!
یہ تو محض وہم ہے تیرا
کہ منع کیے ہوئے پھول مرجھا کر مر جاتے ہیں

پھول کبھی نہیں مرتے
پھول ہمیشہ نئے قالب میں ڈھل جاتے ہیں
قالب بدل کر سانپ بن جاتے ہیں
اپنے گھر کے کونوں کھدروں میں

کہیں چھپ جاتے ہیں

ان کو منع نہ کر
نمسکار کر کھلتے ہوئے پھول کو
نمسکار کر
سینے کے اندر کی نیکیوں بدیوں، آرزوؤں کو
نمسکار کر سینے کے اندھیروں کو
نمسکار کر باطنی کائنات کو

اس کے ساتھ جھگڑا مت کر
پاگل ہو جائے گا

قربانی

نام تیرا تحلیل ہوتا ہے میرے وجود میں
نمود کی طرح
پھوٹتی ہیں نرم کونپلیں
شکر ہے وہ کسی کو دکھائی نہیں دیتی

تیری پلکوں کے جھپکنے سے
بج اٹھتے ہیں ہزار ساز
میرے پانی کی تہوں میں

تیرا چہرہ
جیسے ایک چاند مجھے دیکھتا ہے
ایک چاند مجھے جانتا ہے
دور دور سے مجھے اپنی آنکھوں سے چھوتا ہے

پیرہنوں کے پار
چھپی ہوئی ہے ایک پوری کائنات

طلوع آفتاب کے دو منظر
مہکتے ہیں

کالے گلابوں کے پاس
جڑی ہوئی ہیں چندن کی گیلیاں

اس چاند کی لو میں
اچھلتا ایک سمندر ۔ میں
دیواروں کو ریزہ ریزہ کرتا ہوا
پانی چھلکتا تیری آنکھوں سے
پانی چھپاتا اپنے پانی میں نیم گرم چاند
تیرے طلوع کے منظر

پانی چڑھتا سنگ مرمر کی تیری نار سائیڑھیاں
پانی پُر کیف وارفتہ
پانی لیتا الاپ
تانیں، جھالیں، تیرے گنبدوں کے قریب

پانی لوٹتا
اور پھر بن جاتا ۔ میں،

میں دیکھتا ہوں
بوسیدہ دیواریں گھر کی
سیلاب زدہ ایک کنبہ
قربانی لے کر اترتا دریا

میں چلتا ہوں تمھاری طرف

میں چلتا ہوں تیری طرف
تو پاؤں تلے
مقدس کتابوں کے ورق ہوتے ہیں

لوریاں آتی ہیں
میری ماں کی
میرے پاؤں تلے
آتی ہے
اخبار میں چھپی
میری تصویر

میرے پاؤں تلے آتی ہیں پکی جگہیں
اجداد کی سمادھیاں
اور ان کے اُپدیش

اگر یہ سب پاؤں تلے آتا ہے

تو ضرور تو مستقبل کی طرف جا رہا ہے

یہ جو کچھ تیرے پیچھے
بین کر رہا ہے
یہ تیرا ماضی ہے

اور یہ ہنسی
ان لوگوں کی ہے
جو ماضی کی طرف گامزن ہیں

لیکن یہ کون سسک رہا ہے ہواؤں میں
اور میرے باطن کی گہرائیوں میں؟
یہ شاید تیرے بچے کی ماں ہے
بچوں کو بہلا رہی ہے

اس نے ہر طرح کی
دکھ تکلیف سے بچنے کے لیے
پتہ نہیں کیا اوڑھ رکھا ہے
ربّ کا نام
تیرے لوٹ آنے کی امید
یا اپنے بچوں کا مستقبل

نہیں میں اس سے آگے نہیں جا سکتا

اس سے آگے میری اُمت جائے گی

میں تو یہیں
اس پراسرار تیرتھ کا طواف کروں گا

تیرے، اس کے
اور بچوں کی کشش سے بندھا ہوا
گھومتا پھروں گا

میں نہیں
اس سے آگے میری اُمت جائے گی

☆

میرے ساتھ روٹھ کر سو گئی زمین کے اندر
پتہ نہیں کیا کچھ
اگ رہا ہو گا
خودکشی
بے وفائی
پاگل پن

شاعر کے قتل پر

ایک لرزتا پانی تھا
وہ مر کر پتھر ہو گیا

دوسرا اس حادثے سے
ڈر کر پتھر ہو گیا

تیسرا اس حادثے کو
کرنے لگا تھا بیان
وہ کسی پتھر کے گھورنے سے
پتھر ہو گیا

ایک شجر بچ رہا
احساس سے متحرک
اتنے پتھر!
وہ گنتی کر کے
پتھر ہو گیا

کالی کتھا

وہ رات بیت گئی
لیکن اس کی ستاروں والی چنری
سنسکاروں کے کانٹوں میں الجھ گئی

اجداد کی عدالت نے اس چنری کو
اپنی حراست میں لے لیا

وہ جب کبھی میرے دل کی درگاہ میں
کچہری لگاتے ہیں

میں بیان دیتا ہوں

وہ جب ملی
بہت الجھی ہوئی تھی

کہیں دور چلتے ہیں، اس نے کہا

تو شام کے چوراہے سے
دھوئیں کی طرح نکلتی
ڈھلتی شام کی پگڈنڈی پر ہم چل پڑے

آگے مونہہ جھاکرے کے پیڑ تھے
آگے رات کا جنگل

رات کا جنگل
تو نے اس سے کہا: مڑ چلیں

نہیں
ستارے کسی عظیم کتاب کے لفظوں کی طرح چمک رہے تھے
وہ کہنے لگی
وہ آخر میرے پاس ہی آئے گا
وہ کسی ارفع مقام پر مرے گا
لیکن اس کی مکتی میرے دروازے پر آکر ہی ہو گی
میرا من جنگلی ڈیرا ہے
جس میں محبت کی 'دھونی' سلگ رہی ہے
میں اس کی آخری زیارت گاہ ہوں
وہ جسموں کے جنگلوں میں بھٹکتا اکتا جائے گا
وہ ہوا میں اپنی تصویر بنانے کی کوشش میں پاگل ہو جائے گا
میرے اندر اب بھی بڑی شکتی ہے
میں نے تجھ سے کہا تھا نا؟
میرے جسم میں محبت کی دھونی سلگتی ہے
سلگتی ہے نا؟

شاید بجھ گئی ہے
سلگ رہی ہوتی تو وہ اب تک لوٹ آتا
میں ایک سونی خالی حویلی ہوں
جس کے خلا میں میری ماں کی سسکیاں ہیں
میری سوتوں کی ہنسی ہے
میرے پتا کی موت کی گریہ زاری ہے
میرے بھائی کا پردیس ہے

میں ایک سرد خلا ہوں

وہ پیاسی ریت کی طرح ہونک رہی ہے
ایک پل تپتا ریگ زار
دوسرے پل نیم جاں پرندہ
ایک پل کانپتی تھر تھراتی لو
ایک پل رات میں گھلتی رات
اور دور کہیں چھما چھم ساون اتر آیا
مور کوکنے لگے ہیں
کالی رات میں پیڑوں کا راگ شروع ہو گیا ہے
وہ اس راگ میں تڑپتی رہی
مینہ رم جھم برستا رہا، مسلسل برستا رہا
درختوں کے جھنڈوں میں مور کوکتے رہے
ٹھاٹھیں مارتے پانی میں وہ ہونکتی رہی
اس کی روح میں سکھ اور دکھ
کروٹیں لیتے رہے
اور پھر شدت سے تڑپ کر وہ شانت ہو گئی

اس کے چہرے تلے
دور تک تپتے ٹیلوں کی ریت
بھیگے ہوئے ہنس جیسی ہو گئی
بس ایک پل بعد ہی
ستاروں بھرے آسمان کا رسم الخط بدل گیا
آباواجداد، آسیبی روحیں
آپس میں تکرار کرنے لگیں
رات ایک دندانے دار پہیے کی طرح
میرے قریب آتی گئی
پھر کسی عجیب و غریب زبان میں
آسیبوں کی پنچایت نے فتوہ سنایا
جو کچھ کچھ سمجھ آیا
بھوکی مٹی، اندھی بہری بارش، گہری کالی رات
مساوی ہیں بدکاری کے
وشواس گھات کے

پھر وہ ملا
تھکاماندہ
ٹوٹے ہوئے ساز جیسا
من کی ٹوٹی سبز شاخوں جیسا

میں نے اس کے ساتھ بحث کی
وہ کوئی کھیت نہیں
اس کی بھی کوئی رضا ہے

تو نے اس کی کیا حالت بنا دی
وہ تو پاگل ہو جائے گی مر جائے گی

میں نے اس کے ساتھ بحث کی
لیکن پھر بھی پتہ نہیں کیوں
میرے من کا کوئی حصہ رو تا کر لا تا ہے

اور مجھے آباو اجداد کی عدالت میں
پیش ہونے کے لیے
اکثر بلاوا آتا ہے

اے میرے آباواجداد

اے میرے آباواجداد
مر مر کر جینے والو
کیا ضروری ہے بھلا
ہمیں اس چھلنی میں چھاننا
کہ ہماری ہنسی چھن کر دوزخ کی آگ میں گر جائے گی
اور اوپر کچھ آنسو رہ جائیں گے

اے بیٹو، نوجوانو!
تپتے، کھپتے
ضروری ہے درختوں کا اس دروازے سے گزرنا
جہاں سے گزرتے ہوئے
وہ پیڑ نہ رہیں
اور بن جائیں تابوت، میز اور کرسیاں
بن جائیں دروازے

اے میرے آباواجداد

مر مر کر جینے والو
کیا ضروری ہے بھلا
تمھارا مر مر کر جینا
دلوں میں بس کر ہمارا سرخ لہو پینا

بیٹو، نوجوانو!
تپتے، کھپتے
ہم تو مدتوں، برسوں سے مر چکے ہیں
ہم تو اپنی چتاؤں میں جلنے سے پہلے ہی
سرد ہو گئے
ہم زندہ نہیں ہیں
یہ تو تمھارے ذہنوں میں ہماری کوئی یاد ہے
ہم نہیں بولتے
ایسے ہی کوئی یاد کی ترنگ سے
لہو میں تمھارے شوکتی پھرتی ہے

تاریخ

تاریخ تو ہر نسل لکھے گی
بار بار پیش ہوں گے
مرے ہوئے لوگ
زندہ لوگوں کی عدالت میں

بار بار قبروں سے اٹھائے جائیں گے پنجر
ہار پہننے کے لیے
کبھی پھولوں کے
کبھی کانٹوں کے

وقت کی کوئی آخری عدالت نہیں
اور تاریخ کبھی آخری بار نہیں لکھی جاتی

میں رات کا آخری جزیرہ

میں رات کا آخری جزیرہ
کٹ رہا ہوں، محوِ فغاں ہوں
میں ختم ہو چکے وقتوں کا آخری ٹکڑا ہوں
زخمی ہوں
اپنی باتوں کے جنگل میں
چھپا ہوا کراہتا ہوں

تمام مر چکے اجداد کے ناخن
میرے سینے میں پیوست ہیں
ذرا دیکھ تو سہی
مرے ہوئے لوگوں میں بھی زندہ رہنے کی کتنی ہوس ہے

نہیں

ٹھہری ہوئی رات میں اس نے اس طرح پکارا
کہ قبروں اور شمشانوں سے
ہزاروں اجداد چنگھاڑ اٹھے

محترم باپ کا سر کانپا
اور چند لمحوں میں اس کے بال سفید ہو گئے

پوتر کتابوں کے الفاظ تلے پھول دکھائی دیے
پانی پر تیرتے ہوئے

مری ہوئی ماں چونک اٹھی

ٹھہری ہوئی رات میں اس نے 'نہیں' کچھ اس طرح کہا
کہ ستارے
کئی لمحوں تک جھانجھنوں کی طرح جھنجھناتے رہے

مٹی سے سرخ گلاب نمودار ہوا

اہلیا جاگ کر رقص کرنے لگی

پیڑوں سے سینکڑوں پتے جھڑ گئے اور
ہزاروں نئے پتے آ گئے

بہت کچھ ٹوٹنے کی آواز آئی
بیڑیاں، ہتھکڑیاں، جیل کی دیواریں اور زنجیریں

کیسی بھیانک چیخ سنائی دی
شاید اندھیرا مر رہا تھا
جو صدیوں سے بیمار تھا

ٹھہری ہوئی رات میں اس نے
'نہیں' کچھ اس طرح کہا تھا
کہ لوہے کے گیٹ میں سے
ہزاروں بچے شور مچاتے باہر نکلے
اور وہ پتھر کے بنے مگرمچھ کے منہ کی طرح
کھلا رہ گیا

خود سے خطاب

ہم شعور کی زنگ آلودہ گھڑیاں ہیں
وقت کے کسی ہندسے پر
بس ایسے ہی رکی کھڑی ہیں

جب کوئی حادثہ جھنجھوڑتا ہے
ہم جوش میں آکر بوکھلاہٹ میں رواں ہو جاتی ہیں
کچھ دیر ٹک ٹک کر کے
ایک ساتھ، یا ایک ایک کر کے
پھر ایسے ہی، کسی ہندسے پر رک جاتی ہیں

اس دوران ہمارے ذہنوں میں پلتے رہتے ہیں
ہم سے چھپ کر
عجیب عجیب ارمان، جذبے اور خیال
جیسے جالا اور زنگ

آدمی اپنے من کے اندر اترے

بہت گہرا
یہ بہت ضروری ہے
دیتا رہے آتما کے دروازے پر پہرہ
بہت ضروری ہے

نہیں تو آتما کے اوپر
پہلے چھوٹے اور ہلکے
پھر بڑے اور گہرے
داغ پڑنے لگتے ہیں

اور آتما کے تار
کچھ دیر کپکپا کر
انھیں برداشت کرنے لگتے ہیں

اور پھر آہستہ آہستہ
اپنی آتما پر
کسی اور کا حق ہونے لگتا ہے
منظر گدلا ہے کہ ہماری آنکھیں
شک ہونے لگتا ہے

ابھی نہیں تو کچھ روز رک کر سہی
اَن گنت سیاہ راتوں میں بھٹک کر سہی
کیا صحیح ہے، کیا غلط
اس شش و پنج کی صلیب پر
لگاتار لٹک کر سہی

منظر میں جو کچھ گدلا ہے
اس کی طرف انگلی اٹھانا ضروری ہے
بصارت پر ذرا بھی داغ پڑ جائے
تڑپ اٹھنا ضروری ہے

نہیں تو آتما کے اندر
نہ کچھ ٹھیک طرح کہا
نہ سنا جائے گا
سب ٹھیک ہے، سب چلتا ہے
یہی آواز، بہت گہری
من میں اتر جائے گی

میں نہیں کہتا اپنے بچے کو
کھلونے مت دینا
مٹھائی مت دینا
اسکول کی وردی،
اجلی قمیص اور نکٹائی مت دنیا
یا اس کے لیے بنک بیلنس چھوڑ کر نہ جانا
سانس لے سکے اس کی آتما سکون سے
ایسی فضا چھوڑ کر جانا

پکّا گھر بھی ضروری سہی
لیکن زندگی کی اچھائی میں
اس کا پکّا وشواس بھی ضروری ہے
ہمارے بچّے کے لیے

ہماری لمبی عمر بھی ضروری سہی
لیکن ہماری جگمگاتی روشن تاریخ بھی ضروری ہے

لیکن فی الحال ہماری تاریخ کی صورتِ حال یہ ہے
کہ اس کے شعور کی زنگ آلود گھڑیاں ہیں
اور وقت کے کسی ہندسے پر
بس ایسے ہی رکی کھڑی ہیں

لوٹ کر

تو بہت روئی چلائی
وہ لوٹ کو نہیں آیا

پھر ایک دن
تیرے چہرے پر
مسکراہٹ لوٹ آئی

زندگی اے زندگی
موت سے تم کبھی نہیں ہارتی

اُداسی

چتاؤں کی راکھ کا سرمہ لے کر
جنھوں نے آنکھوں میں ڈال لیا
کھلے پھول تک انھیں دیکھ کر ہنسنے لگے
آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے

چِٹّھی

اس کو محبت بھرے خط لکھتے رہنا
ورنہ غیروں کے شہر میں
شاخ برہنہ ہو جائے گی

ان کی آہ وزاری

ایک بار پھر آپ آیئے
وہ کہتے ہیں
ترس گئے ہیں ہم

آپ بہت یاد آتے ہیں
سر پھرے سورج کی دھوپ کے جامنی دنوں میں

جامنی دن
جب آم کے پیڑوں پر
آم نہیں
پستان لگتے تھے
جب خربوزے کے کھیتوں میں
چیرے ہوئے زانو ملتے تھے
اور سورگ کی جانب جانے والا راستہ
بہت سیدھا تھا
دشمنوں کی زائیدہ عورتوں کے درمیان سے
گوشت کے پلوں تلے سے گزرتا

آگ کے پانی کی طرح

جامنی دن
زنا بالجبر بھی
جہاد کا حصہ تھا
گناہ ہی ثواب تھا
سیاہ شوریدہ خواہش
اور آدرش کے درمیان
کوئی تضاد نہیں تھا

ہمارے کسی مقدس فرض کے بہانے
ایک بار پھر آیئے آپ
سر پھرے سورج کے جامنی دنوں میں

ہم آپ کے بہانے
رہائی دے دیں گے
اپنے اندر مقید گدلے دریاؤں کو
اجداد کی پیاسی آسیبی آتماؤں کو
دبے ہوئے تاریک جذبوں کو

پیشین گوئی

رات دیوالی کی تھی

میں نے اوپر چڑھ کر دیکھا
جو کبھی نہیں دیکھا تھا
کہ آدھے شہر میں دِیے جل رہے تھے

رات دیوالی کی تھی
اور آدھے شہر میں دِیے جل رہے تھے

یہ تو کوئی تیوہار نہیں تھا
زمین آسمان کے درمیان لٹکی
کوئی تصویر تھی
تحریر تھی
منحوس سی پیشین گوئی تھی
جو سیاہ رات کے کالے صفحے پر
آگ کے زرد کانپتے حرفوں میں لکھی ہوئی تھی

میں نے پڑھ کر دیکھا
اس زرد اور سیاہ پیشین گوئی کو
عبرت ناک سی اس کی عبارت
کچھ اس طرح تھی:

جب آدھے شہر میں ماتم ہے
آدھے شہر میں دیپ مالا ہے
شہر کب تک یہ شہر آباد رہنے والا ہے
یہ دیے کہاں ہیں دیے
یہ تو ہیں جیسے آگ کی زبانیں
یہ اندھیرا ستاروں بھری بھیگی رات نہیں ہے
یہ اندھیرا تو سازش ہے

یہ دیے بھی، یہ اندھیرا بھی
یہ تو خاموش نعرے ہیں
یہ تو ہتھیار ہیں
اشتہار
پراسرار دوئی والے

خیر جل گئے وہ دیے
ڈھل گئی رات
اور وہ ٹل گئے۔ تیوہار اور پیشین گوئی
شاید اس لیے کہ ذہنوں کے اندر
کوئی تاریخ باقی تھی

آنے والی کل کی آس باقی تھی

لیکن اگلی بار

اب تیوہار سے پہلے

شہر کے دل کا دکھڑا اچھی طرح جان لینا

ان ماؤں کے آنسو پونچھ دینا

جن کے بیٹے، مسافر گھر لوٹ کر نہیں آئے

یا موت کے جنگل میں کہیں گم ہو گئے

جن کے بن باس اب کبھی ختم نہیں ہوں گے

اور ان کمہاروں، تیلیوں اور روئی دھننے والوں کو

صلاح دینا

جنھوں نے دیے بنائے تھے

جلنے کے قابل بنائے تھے

تو پھر ایسے دیے جلا کر رکھنا

اپنی منڈیر پر

جو کسی گھر کے اندھیرے کا مذاق نہ اڑائیں

وہ دیے رات کے سیاہ مخملیں صفحے پر

لکھے ہوئے محسوس ہوں گے

کسی آشیرواد جیسے

دیوالی اس وقت ہی تیوہار ہو گی

اس وقت تک تو یہ سب کچھ

پیشین گوئی

زمیں اور آسمان کے درمیان لٹکی
کوئی تصویر ہے
تحریر ہے
منحوس سی پیشین گوئی ہے
جو سیاہ رات کے کالے صفحے پر
آگ کے زرد کانپتے حرفوں میں لکھی گئی ہے

ہمارے سینے میں تو، اے بیٹو
سوچیں ہیں گدلی، میلی
خنجر تمھارے چمچماتے
اجلے شفاف ہیں

پیارے مریدو، تم
ہماری ہی شکتشا کی گونج ہو
آؤ تمھیں مرشدوں کے قتل معاف ہیں

اب ندیوں کے بارے میں

اب ان ندیوں کے بارے میں
میرے پاس کہنے کے لیے کیا ہے

میرے رہبر نے یوں کہا تھا
سورج، چاند چراغ ہیں میرے، تھال گگن ہے
کائنات ایک سازینہ
ماضی، مستقبل اور حال کی سب آوازیں
اس راگ میں گھل مل گئی ہیں
یہ سب ایک سازینہ

رات دن میرا رہبر چلتا رہا
ویرانوں کو اس نے پگڈنڈیاں دیں
اور پگڈنڈیوں کو منزلیں
نیندوں کو سپنے دیے
سپنوں کو صورتیں

جب صورتیں روشن ہو گئیں
تو اندھیرے کو فکر دامن گیر ہوئی
ڈولنے لگے ایوان اس کے
اور ایوانوں کی بنیادیں
تھر کنے لگیں جب دلیلیں
لہرا گئی شاہی تلوار
سر قلم کر دِیے

پھر اٹھی حق کی تلوار
سورج کی طرح فطری انداز میں
تلواروں کا اپنا مفہوم نہیں ہے کوئی
تلواروں کو مفہوم دیتے ہیں ہاتھ
اور ہاتھوں کو ذہن
ذہنوں کو تاریخ

الجھ گئے ہیں ہمارے آج کل
ذہن اور تاریخ

آپس میں تکرار کرنے لگے ہیں
پاک پوِتر صفحے اور اخبار

سورج کا سندیش
دِیوں کا گریہ

روحوں کے دکھ کے قطرے

اور ربّی دریا

گھروں کی دیواروں پر دکھائی دیتے ہیں

روٹی سے بھوکے مونہوں کا فاصلہ
اتنا طویل ہو گیا ہے
کہ فلسفیوں کو نگل گیا
اور خود فلسفہ بن گیا

پہلی بات یہ دھرتی
دوسری بات ہل کی بنائی ہوئی لکیر
باتوں میں یہ بات حق حلال

اور تلوار؟
تلواروں کا اپنا مفہوم نہیں ہے کوئی
تلواروں کو مفہوم دیتے ہیں ہاتھ
اور ہاتھوں کو ذہن
ذہنوں کو تاریخ

بے گھر

یہ تمھارے لفظ کا دربار ہے
اور لمحہ بہ لمحہ
الجھتا ہی جا رہا ہوں میں بے گھر
تیرے چہرے پر کوئی داغ بھی نہیں ہے
کہ میں چھاؤں میں بیٹھ جاؤں

بے گھر وہ نہیں ہوتا
کہ جس کا کوئی گھر نہیں ہوتا
بے گھر وہ ہوتا ہے
جو اپنی نظر سے گر جائے

خوف

بن رہے ہیں انسانوں سے پھر پتھر
پھر مٹی
پھر پانی
بن رہے ہیں سطروں سے پھر لفظ
لفظوں سے
چیخیں
چنگھاڑیں

دھرتی الٹی ہو کر گھوم رہی ہے
خوف سے

کھا رہی ہے پیڑ مٹی
ندیاں واپس اپنے دہانوں کی طرف جا رہی ہے
پھول پیچھے کی طرف لوٹ کر جا رہے ہیں

پھینک کر یہ ساز

یہ پوتر کتابیں

یہ پیارے چہرے

دوڑ پڑیں گے ہم صرف ایک جان لے کر

ہم انسان تھے صرف جاندار بن کر رہ گئے

زندہ لوگوں کی عدالت میں
متواتر مرے ہوئے لوگوں کو پکارا جا رہا ہے
کبھی تو مرے ہوئے لوگ منصف بن جاتے ہیں
کبھی خراج ادا کرتے ہیں

قبروں میں بھی سونے نہیں دیتی
سنتان جو بندی[1] ہو یا نادی
ایک بار جو جنم لے لیں
وہ ازلی ابدی طور پر سلگتے رہتے ہیں

[1] بندی : وہ جسمانی اولاد جو مرد و عورت کے اختلاط سے پیدا ہوتی ہے
نادی : معنوی اولاد

میں جہاں کھڑا ہوں

میں جہاں کھڑا ہوں
یہ میری ہی دھرتی ہے
بار بار میں اپنے آپ کو وشواس دیتا ہوں

یہ لوگ جو میرے آس پاس ہیں
ان کے ہاتھوں میں جو 'کچھ نہیں' ہے، وہ
کسی افواہ سے چاقو بن جاتا ہے
کسی افواہ سے پتھر
کسی افواہ سے شبنم میں بھیگی پھولوں کی شاخ

یہ جو میں کہہ رہا ہوں
یہ پتہ نہیں کہ یہ دھوپ ہے یا پانی یا پون
یا آرے کے دندانے

میرے لفظوں کے سب اعتبار
ختم ہو چکے ہیں

میری ہر بات کی زنجیر میں
ایک کمزور 'شاید' کی کڑی ہے
کسی پل بھی میری باتوں کی زنجیر ٹوٹ سکتی ہے
بکھر سکتی ہے

یہ سچ ہے
کہ میں اس دھرتی سے اُگا ہوں
لیکن یہ بھی سچ ہے
کہ خوف پیڑوں کی جڑ کو بھی
بنا دیتا ہے تیکھے نوکیلے پیڑ
پیڑ بھی تیز دوڑتے ہیں راتوں کو
ایک دوسرے کو کاٹتے، روندتے، پھنکارتے ہوئے

چلو مانا کہ پیڑوں کے
کبھی پاؤں نہیں اُگتے
لیکن کیا پیڑ کو پتہ ہے
کہ کل ایک لکیر اس کے قریب سے
گزر جائے گی چپ چاپ

اور پھر ہو گا فیصلہ
کہ پیڑ کو چیرا جانا ہے
یا اس کو برقرار رکھا جانا ہے
اگر اس کو چیرا جانا ہے
تو پھر اس کا کیا بنانا ہے

یہ پیڑوں کے گھنے جنگل یہ کیا جانیں بیچارے

کبھی پیڑوں کی رائے لے کر
تو آرے نہیں چلتے

تیّاری

چلو تیاری کرو
اٹھاؤ یہ اپنی آدھی ادھوری نظمیں
یہ پُل جو نامکمل ہیں۔ انھیں ایسے ہی رہنے دو
سمت بدل لیں گے
آج یا کل سب دریا

اٹھاؤ گٹھریاں الجھے ہوئے سے خیالوں کی
دلیلوں، نکتوں، منطقوں اور مثالوں کی
اٹھاؤ اپنے پرنتو، اگر، مگر، لیکن
یہ کام آئیں گے اب کچھ اور بھی موضوعات پر
بحث کرنے کے لیے
کہ یہ موضوع بھی ختم ہو گیا
ہونا تھا جو وہ بھی ہو گیا

ہم جو کچلے روندے گئے
بچ گئے یاڈرتے رہے

ہم جو مارے گئے، نیم جاں رہے یا مرتے رہے
ہم تو پتے ہیں خشک، ہرے یا نئے ہرے پھوٹتے ہوئے
کسی کا رنگ سبز ہے کسی کا زرد
کس طرف جائیں گے
کون سی ہے ہمارے سمت
ہمیں کچھ نہیں پتہ

ہمارا فیصلہ تو کرتی ہیں سدا ہوائیں
یہ تیز آندھیاں، جھکڑ
یہ کہاں بنتے ہیں
ہمیں کچھ نہیں پتہ
گرمی کو گالی دو یا آندھی کو
یہ گالی اپنی ہی بیچارگی کو لگے گی

سنبھالو سینے میں یہ کڑوے پن گالیوں کے
اٹھاؤ گٹھڑیاں الجھے ہوئے خیالوں کی
دلیلوں، نکتوں، منطقوں اور مثالوں کی

پیارا

میں جن کو کبھی شاعری کا درس دیتا تھا
کتابوں میں چھپے ہوئے سیاہ حروف میں سے
رنگ برآمد کرنا سکھاتا تھا
اور وہ جو پیار کی کوِتا سن کر
ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تھے
مجھ سے چوری مسکراتے تھے
جب کوئی نظم تیور بدلتی تھی
تو ان کے صاف شفاف کومل چہروں کے
بدلتے ہوئے رنگ مجھے بتاتے تھے
'سر! ہم کوِتا سمجھتے تھے'

ان شاخوں جیسے لڑکوں میں
ایک کا نام پیارا تھا
وہ سب کی آنکھوں کا تارا تھا
میں نے اس ستارے کو آسمان ہوتے دیکھا تھا
میں نے پیارا جوان ہوتے دیکھا تھا

وہ گاتا تھا تو کالی پون میں دیا جلاتا تھا
میں نے اس کی آواز کو اوپر اٹھتے ہوئے سنا
اور پھر سنا
ایک دن کچھ مدت بعد
پیارے کو کسی نے قتل کر دیا
اور میں نے سوچا ہی نہیں
یہ تو وہی پیارا ہے

یہ کوئی اور ہو گا
کوئی خونخوار، انتقام کی آگ میں جلتا ہوا
کوئی ڈاکو ہو گا، کوئی چور ہو گا
وہ تو شاخ تھا۔ کسی کو اسے بھلا کیوں جلانا تھا
اس کو پیارے کو کسی نے کیوں قتل کرنا تھا

میں نے سوچا ہی نہیں
کہ یہ وہی پیارا ہے

وہ گاتا تھا تو کالی پون میں دیے جلاتا تھا
اسی بات سے خفا ہو کر
اندھیرے کے خداؤں نے
پیارے کو قتل کر دیا
اور اب جب بھی کبھی میں شاخوں جیسے لڑکوں کو
کِوتا پڑھاتا ہوں
کتابوں میں چھپے ہوئے سیاہ حرفوں میں سے

رنگ بر آمد کرنا سکھاتا ہوں
تو مجھے لگتا ہے
ان لڑکوں میں پیارا بھی کہیں بیٹھا ہے
اور میں کوِتا پڑھاتا اکھڑا جاتا ہوں
سوچتا ہوں
کیا پڑھاتا ہوں
اندھیرے کے خداؤں کو، بجھانے کے لیے
دیے بناتا ہوں
اندھیرے کے خداؤں کا کرمچاری
اندھیرے مندروں کا میں پجاری
ہے پیارے سے بڑھ کر
جس کو اپنی جان پیاری

سائیں جی

دھونی
سائیں جی کے آگے نہیں، ان کے اندر جلتی ہے

سائیں جی کبھی کبھی
بڑی سی اداس آواز لگاتے ہیں

جب سائیں جی گاتے ہیں
تو اپنی ہی انتڑیوں کا ساز بجاتے ہیں

گاتے گاتے سائیں جی
چپ ہو جاتے ہیں
اس خاموشی میں ایک ساز بجتا ہوا سنائی دیتا ہے
وہ ساز دکھائی تو نہیں دیتا
لیکن سنائی دیتا محسوس ہوتا ہے
اس ساز کے
قبر سے لے کر اندھیرے آسمان تک

لمبے، کالے، سیاہ تار ہیں
تاروں میں گھومتے ستارے آپس میں ٹکراتے ہیں
چاند گونجتا ہے
ہزاروں مردہ وزندہ دھنوں کاالاپ جاگتا ہے
اور کبھی کبھی یوں لگتا ہے
جامنی پھولوں سے درخت بھر رہے ہیں
مائیں اپنے بچوں کو سینے سے لگائے
اور مرد اپنی کلہاڑیوں سے
رات کو کاٹ رہے ہیں
پھر لگتا ہے کسی کا چاند دھرتی پر پڑا ہے
اس پر کسی کا ماتم میں ڈوبا بدن جھکا ہوا ہے
اداس چھاتیاں
اداس دودھ کی بوندوں سے بھرے
جلتے آنسوؤں سے بھرے
جس طرح لوریوں، بینوں سے بھرے
دو مرجھائے پھل

سائیں جی سویرا ہو گیا
چلیے مدرسے چل کر علم دیں طالب علموں کو
انھیں پڑھانا ہے

ایسا لگتا ہے آج آپ نہیں جائیں گے
آپ سوچتے ہیں کہ وہاں جا کر کیا پڑھائیں گے
اگتے پودوں کو اداس پانی دیں گے
پھولوں کو مرجھانے کے براہِ راست اور بالواسطہ طریقے سکھائیں گے

اندھیرے کی کتاب کو
جس صفحے پر بھی کھولیں گے
اس میں دل کی سیاہی ملائیں گے
سچ بتایئے سائیں جی یہی سوچتے ہیں آپ

لگتا ہے آج آپ میرے ساتھ بھی بات نہیں کریں گے

ویسے بولنے میں رکھا بھی کیا ہے
سچ پوچھیے تو آپ نے کہا بھی کیا ہے
ہمیں تو انتظار ہی رہا
کہ آپ سلگتے رہو گے تو ایک دن بے اختیار لٹ لٹ جل اٹھو گے
مشعل اٹھا کے چل پڑو گے
رستہ دکھاؤ گے
اداسی کی قید سے رہائی پاؤ گے
اور پھر لوگوں کو آزاد کراؤ گے
لیکن لگتا ہے
آپ بیڑیوں، ہتھکڑیوں سمیت ہی
چلے جائیں گے
پیچھے رہ جائیں گے آپ کے خون سے لکھے ہوئے جملے

معاف کیجیے خون سے لکھنے سے تو بہتر تھا
آپ روشنائی سے لکھتے
لیکن پیشانی کی روشنی میں لکھتے
الجھے خیالوں کو کچھ سلجھاتے
دکھ کی کوکھ سے باہر آتے

اس طرح سائیں جی دیر تک
اپنے آپ کو کوستے رہے
پھر مدرسے کی طرف چل دیے

وہاں طالب علموں کے کورے کاغذ تھے
معصوم تجسس بھری آنکھیں تھیں
سائیں جی نے کہا
پیارے بچّو
لکھو
اپنی جان کا خوف
اپنے بچوں کے چہرے
اپنے نام کا موہ
نفسانی خواہشیں

یہ چاردیواری آدمی کو عمر بھر
قید کیے رکھتی ہے
نہیں یہ رد کر دو
لکھو
ہمارا نظام ایسا ہے
کہ اس میں انسان کو
اپنی ہزاروں خواہشوں کو
کچلنا پڑتا ہے
یہی کچلنا ہی اداسی ہے
یہی دہشت ہے ۔ لکھو

نہیں یہ بھی نہیں
آپ لکھو۔۔۔

پھر سائیں جی بڑی دیر تک کچھ نہیں بولے
شاید وہ اپنے من کی بولی کی
سیڑھیاں اترنے لگے تھے
جہاں اداس ماؤں کے آنسوؤں کا پانی تھا
سائیں جی کا تیرتھ تھا
ان کی درگاہ
جب سائیں جی آئیں گے
تو اداس گیت گائیں گے
پھر گاتے گاتے خاموش ہو جائیں گے

ان کی خاموشی میں
وہی ساز بجتا ہوا سنائی دے گا
جو دکھائی تو نہیں دیتا
لیکن سنائی دیتا محسوس ہوتا ہے
اس ساز کے
قبر سے لے کر اندھیرے آسمان تک
لمبے، کالے، سیاہ تار ہیں
تاروں میں گھومتے ستارے آپس میں ٹکراتے ہیں
چاند گونجتا ہے
ہزاروں مردہ و زندہ دہنوں کا الاپ جاگتا ہے

اجداد کی راہ گزر پر

آتی سردیوں میں
یا ایک دو برسوں میں
بے لگام واقعات
بے شمار واقعات
روگ، سوگ، شکستوں میں
جال میں، تانے بانے میں
بے پہچان خوف میں
ہر طرح کے وہموں میں
ڈرے ڈرے بھیدوں میں
گھر جاؤں گا آسیبوں میں

تکلّم نہ ہو گا
اپنی ہی سوچوں کی
تشریح و تفسیر نہیں ہو گی

شام اتر آئے گی

اندھیرا ہو جائے گا
میں بھی پھر جاؤں گا
دیے رکھ کر ہتھیلیوں پر
اجداد کی راہ گزر پر

آگ جو کہ چھاتی میں
سلگتی ہی رہتی ہے
دیوں کو سونپ دوں گا
خود پُر سکون ہو جاؤں گا

کنواں چلتا ہے دن رات میاں

کنواں چلتا ہے دن رات میاں
ابھرتی ہیں مٹکیاں دن رات میاں
مٹکیوں سے چھنتی ہے پربھات میاں

مٹکیاں بھری ہوئی چھلکتی ہوئی
اونچائی سے نیچے کی طرف جھکتی، چمکتی ہوئی
آب رو میں ڈھلتی
نالیوں میں بہتی
پہنچی ہے پاتالوں کی سوغات
کیاروں تک
اتھاہ گہرائیوں تک

بیج سر پر سبز شملے سجائے چل پڑے ہیں
فصلوں کی ہری بھری بارات میاں!

پاتال سے لے کنوؤں تک

کنوئیں سے گاؤں کی حدوں تک
گاؤں کی حدوں سے گھروں کی دہلیزوں تک
معصوم بچوں کے ہونٹوں تک
پہنچتی ہے خدا کی ذات میاں

اب صبح کاذب کی ساعت ہے
اب پو پھٹی ہے، صبح، سویرا ہے
اب بھری دوپہر ہو گئی ہے
اب شام ڈھل گئی ہے
اب رات ہو گئی
اب یہ وقت ہو گیا
پھر صبح ہو گی
پھر پو پھوٹے گی، پھر شام ہو گی
دھرتی سے لے کر امبر تک

چلتی ہے کل کائنات میاں
کنواں چلتا ہے دن رات میاں

اس کنوئیں میں کیا کچھ ڈوب گیا
جو ڈوبا تھا وہ بھول گیا
لیکن یادداشت کی حدوں تک کبھی کبھی
ابھی بھی آ ہی جاتی ہے
برسوں کی سو گہرائیوں سے
کوئی چیز پرانی زنگ آلودہ
کوئی بھولی بسری بات میاں

کوئی بیتی گزری رات میاں

ایک رات بڑی اندھیری رات تھی
زلفوں میں کالا جادو تھا
سینے میں طلوع کے منظر تھے
جب جاگے تھے تو آنکھوں میں
ٹوٹے خوابوں کے کنکر تھے
وہ منظر بھی قابل دید تھے
وہ ایسی راہ گزر پر دور چلی گئی
میں دور تک اور دیر تک دیکھتا رہا
پھر دن بدلے کچھ دل بدلے
وہ آنکھوں کے اندر کے چاند اور سورج، بن کر رہ گئے
بس رسوئی گھر کے برتن (توا، پرات) میاں!

وہ رات بھی بڑی سیاہ تھی
جس کی صبح کرنے ہم نکلے تھے
دل میں دکھ بھری آوازیں تھیں
کچھ نظمیں تھیں، کچھ بندوقیں تھیں
ہتھیلیوں پر جلتے دیے تھے
گلیوں میں زہریلی پھنکاریں تھیں

پھر آس پاس قید خانے تھے
قید خانوں کی اونچی فصلیں تھیں
ایسا لگا عمروں سے بھی زیادہ لمبی تھیں
قید خانوں کے دروازے جب کھلے

ایسا لگا کہ ہو گئی صبح میاں

لیکن آس پاس جالے ہیں
اندھیرا ہے اور دھوکا دھڑی ہے
کچھ لوگ معصوم
کچھ ٹھگنے والے اور زیادہ ہی ٹھگنے والے

اونچی مسندوں پر چلتی ہے
یہ برقرار رہنے کی ہوس سی

یہ برقرار رہنے کی کوشش ہی
خدا سے لے کر شیطان تک
چولہوں سے لے کر شمشان تک
ہر شے کا سہارا لیتی ہے
ہر شے کو اوٹ بناتی ہے
یہ اپنا تخت ٹکاتی ہے
ہاں تخت تو ٹک جائے لیکن کب تک
ہاں لوگ بکیں لیکن کب تک

بس قطرہ قطرہ ڈھلتا ہے
تبدیلی کی رفتار دھیمی سہی
لیکن یُگ ضرور بدلتا ہے

یہ تاج کھڑاؤں، کھوپڑیاں
کئی چیزیں ابھر کر اوپر آئیں

کہاں سے کہاں پہنچ گئیں
ملبے میں دبے محلوں کو
لوگ کھود کھود کر دیکھتے ہیں

دیکھ یہ سمے کا پھیرا ہے
تاریخ کی ہے اوقات میاں
کنواں چلتا ہے دن رات میاں

نام

خوبصورت پیڑ کو دیکھ کر
بادل دیکھ کر تو مور بن جائے گا
دیکھتا ہے مور تو ڈر جاتا ہے ناگ کی طرح تو
ناگ کو دیکھتا ہے تو پتھر بن جاتا ہے

اگر دیکھ لے پتھر تو پھر آئینہ بن جائے گا تو
اور دیکھ لے آئینہ تو پوچھے گا اپنے اپنے آپ سے۔ کون ہے تو؟ کون ہے تو؟

ناگ ہے بادل ہے یہ تو مور ہے
آئینہ ہے پتھر ہے یا کچھ اور ہے
رات رکھ، پربھات رکھ یا شام رکھ
کچھ نہ کچھ آخر تو اپنا نام رکھ

پانی ہے اب بھاپ ہے ۔ اب رم جھم
برف، پھر دریا، پھر ساگر

اس پتھراتے، پگھلتے وجود کا
نام کیا رکھوں ہر لمحہ بدلتے وجود کا

اس عدالت میں

میں نے جو کنول کھلائے تھے اپنے تالاب میں
ان کے حسن کا چرچا
جو آپ نے چھیڑا ہے
میں اس کے لیے اعزاز پیش کرتا ہوں
لیکن کنول تو نہیں
جس میں سے کنول اگتے ہیں
آپ کے سامنے وہی کیچڑ پیش کرتا ہوں

جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے
میں نے یہی دیکھا ہے
کہ اس دل میں کوئی سوگ ہے، اداسی ہے
کوئی کانٹا ہے جو سوچ میں مسلسل خلش پیدا کرتا رہتا ہے
میری جان پریشان ہے، بے امید ہے

ہمیشہ کھوجتا رہتا ہوں اداسیوں کے قدموں کے نشان
ہر بار یہ تلاش ختم ہوتی ہے میرے دل کے قریب

میں پیچھے پیچھے چلتا ہوں خون کے قطروں کے
یہ قطرے ختم ہوتے ہیں اس غار میں جا کر
جس غار میں میرے من کا ہی اندھیرا ہے
کئی بار میں نے پکڑا ہے ہاتھ دشمن کا
ہر بار میں نے دیکھا ہے کہ یہ ہاتھ میرا ہے

غار میں پڑی میں
خود غرضیوں کی کھائیاں
غار میں ڈھکے پڑے ہیں
آسیب میری انا کے
غار میں سیاہ آرزوؤں کا کوئی جنگل
غار میں خوف ہے
خود کو بچائے رکھنے کا

اگر یہ نہ ہو تو میں دھوپ کی طرح پھیل جاؤں
سرسبز زمین پر، صاف شفاف، آزاد اور بے خوف
نہ کوئی ڈر کہ میرے داغ دیکھ لے گا کوئی
نہ پردہ داری
نہ میری جان عزیز کا خوف

داستاں بھی جس کی سلاسل سے آزاد ہو کر نہ لکھی جا سکے
وہ چور چپ جیسی زندگی بھی کیسی زندگی ہے
جس کی میلی سی گٹھڑی بھی کوئی کھول نہ سکے
وہ کیسا دل ہے، کیسی آتما، کیسا من ہے

کبھی ایسا وقت بھی آئے کہ اس طرح میں کہوں

کہ لو میں بجھ گیا ہوں
اس زمین پر روشنی کی طرح
میں آج اپنی انا کی روشنی کرتا ہوں
لو پیش ہیں یہ میرے جلے بجھے ستارے
میں ذہن کو آزاد کرتا ہوں، روشن کرتا ہوں، آسمان

ہاں گہرا، شور کرتا دریا
لیکن اس عدالت میں
بہا جاؤں کچھ ایسا سطح کے قریب کہ میری ریت بھی دکھائی دے
میں اپنی رات کو پاؤں بکھیر کر دھوپ میں
کہ میرے خوابوں کے اسرار عیاں ہو جائیں

میرے اندر چھپے اندھیرو آؤ کہ میں اپنی کوِتا کے
دروازے تمھارے لیے کھولتا ہوں
اداس دل کے اندھیرے میں مقید جذبوں کی
رہائی کے لیے تہہ خانوں کا در کھولتا ہوں
اور اپنے وجود کی کشتی کو
یاترا کے لیے آج اپنے نام کی کھونٹی سے کھولتا ہوں

میں جنم جنم سے سلگ رہا ہوں کاش!
آج پُر سکون ہو جاتا
اب میں اپنی اولاد کے روپ میں
جنم جنم سلگتا رہوں گا

پردیس

میں دو تین قدم ہی چلتا
کہ پردیس آجاتا
میرے لگائے ہوئے پیڑوں کے سائے
کتنے چھوٹے ہیں

دو آوازیں

جو لکھنا ہے پانی پر لکھ جا
لہروں کے نیچے اتر جا
تو اب مر جا

ہستی کے اس چوراہے پر
گٹھڑی کی طرح کھل جا
ہو جا لا محدود
اور اپنا نام ٹھکانا بھول جا
توڑ دے اپنے نام کی زنجیر
بے نام ہو جا، بکھر جا

کام، کام تو آگ کی نذر کر دے
موہ موہ تو جل میں بہا دے
کرودھ کرودھ طوفانوں میں اڑا دے
لوبھ لوبھ جنگل کو دے دے
لوٹا دے جو ہے جس کا، جس کا

تجھ سے توقع رکھتا ہے کہ تو نہ بھیگ
آپ ندیاں بہاتا ہے
آپ اکھنڈ ہے لیکن تجھے بتاتا ہے
یہی نیکیاں ہیں، یہی بدیاں
آپ تو گہرائیوں میں بستا ہے
تجھ کہتا ہے تو تیر کر نکل جا

بجھنے والی جوت جلا کر
تجھے پاس بٹھایا
کبھی برسائیں کن من بوندیں
جھکڑ کبھی جھلایا
اگر کبھی جیوتی ڈگ مگ ڈول گئی
تو الزام تیرے سر لگایا

جس نے جوت جلائی
اس نے ہی طوفان پیدا کیا
تو اب راہ پر اس کی جیوتی
اسی کے طوفان میں رکھ جا

تو ہے کون جو بنا پھرتا ہے
جیوتیوں کا رکھوالا
تجھے کب کہا تھا اس نے
یہ اندھیرا - اجالا
ملنے دے یہ اندھیرے اجالے

تو درمیان سے ہٹ جا

سینے میں اعلیٰ اخلاق کے
تجھ کو سود کھ سہنے ہیں
لیکن پھر بھی انھوں نے تجھے
گدلا میلا ہی کہنا ہے
آرزو کے آدرش میں ٹوٹ کر
خود سے بچھڑے رہنا
طوق تیرے گلے میں کس نے پہنایا
اور پہنا کر اس کا کہنا
یہ تو ہے اک گہنا
میں کب میں تھا
پانی تھا، اگنی تھا
پون تھا، دھرتی تھا
اور ان سب کے اندر
تڑپ تھی، ہلچل تھی
جنم مرن تھا
اتار چڑھاؤ تھا
اور کوئی بات نہ تھی

سورج گرم ہو گیا
پانی ابلنے لگا
بھاپ بن کر اڑنے لگا
پربت پر پہنچ کر بادل بن گیا
پانی بن گیا تو برسا

اس ابلنے سے برسنے سے
دکھ سکھ پیدا ہوا

اگنی کو
جیوتیوں، چولہوں، شمشانوں میں بانٹ کر
پن اور پاپ تو خود میں نے ہی بنائے

ربّ میری رچی ہوئی کوِ تا ہے

ساگر میری آنکھوں کے راستے روتا ہے
میں نہیں ہوتا
تو کس کس کی سانسوں کے صدقے
کبھی گیت بن جاتا ہے تو کبھی گہری لمبی دکھ بھری سانس

سورج جب ندی کی پیشانی پر
کرن کا لمس دیتا ہے
یا پربت کا پانی جس پل
ساگر میں مل جاتا ہے
میں نہیں کہتا:
اگر میں نہ ہوتا
تو ان سب کو سکھ دکھ کا احساس کیسے ہوتا

یہ جدائی تو پتھروں میں سے بُت تراشنے کی خاطر ہے

یہ جدائی تو پیڑوں میں سے

تراش کر دروازے بنانے کی خاطر ہے

اور سنجوگ
واپس مڑنا

اور نروان ۔ جنم کی گھڑی سے واپس لوٹ جانا

بدھ پورنیما ۔ الوداعی کہانی

گوتم کے پاؤں میں زنجیر تو نہیں ڈالی گئی
صرف نازک بیل اس کی گردن کے گرد لٹکائی گئی

پھولوں کو دیکھ کر جو اداس ہو جاتا تھا
اس بیٹے کے لیے
پیش نہ چلی شدودھن کی، نہیں تو
روک دیتا وہ سورج کو ڈوبنے سے
موسموں کو بدلنے سے

اپنی اذانوں کے در پر
حکم لکھ کر ٹانگ دیتا:
پت جھڑ کا یہاں آنا منع ہے

زہر ہوتا سانپ کا تو چوس لیتا
اپنے بیٹے کے سینے سے اداسی

پھول جیسے لال میرے
جنگ کے شعلوں میں
پھول بن کر جینا ممکن نہیں ہے

جب نازک بیل پر ایک پھول کھل اٹھا
شدودھن نے کہا
اب کوئی خطرہ نہیں
انتڑیوں کے پھول کو چھوڑ کر یہ اب نہیں جائے گا، لیکن
وہ جو مرجھاتے پھولوں کو دیکھ کر اداس ہو جاتا تھا
چلا گیا وہ
سوتے آنسوؤں کی زنجیر توڑ کر
جب سویرا ہو گا
یشودھرا کے نین بجھ سے جائیں گے

لیکن کیا کہیں گے

ان کا کہنا بھی ایک ایدیش ہے
جو کسی پتھر پر کندہ ہوئے بغیر ہی جاوداں ہے

لیکن نہیں ابھی نہیں
ابھی میرے سینے میں موت کا گھونسلہ ہے
ابھی میری آنکھوں میں جہنم کے الاؤ جل رہے ہیں

میں جو بھی دیکھتا ہوں
دیکھتے ہی راکھ ہو جاتا ہے

میں جو بھی چھو لیتا ہوں
وہ چھوتے ہی ہو جاتا ہے پنجر

مرے ہاتھوں پر رکھے
چاند، سورج چتاؤں کی طرح جل رہے ہیں

آنسوؤں کی بہتی رو
کس طرح بجھا سکتی ہے اتنی ساری آگ۔۔۔

انتظار میرا

لگتا ہے
میرا ہو رہا ہے کسی اور جگہ انتظار
اور میں یہاں بیٹھا ہوں

لگتا ہے
میں کائنات کے اشارے نہیں سمجھتا

پل پل کی لاش
پل بن کر
بجھ رہی ہے میرے آگے
اور مجھے لیے جا رہی ہے
کسی ایسی سمت میں
جو میری نہیں ہے

گر رہا ہے
میرا عمر کا پل پل

کنکروں کی طرح
میرے اوپر
بن رہی ہے بڑی اونچی ڈھیری
نیچے سے سنائی نہیں دیتی آواز میری

آدھی رات
جب کبھی نیند کھل جاتی ہے
سنتا ہوں نغمۂ کائنات
تو ایسا لگتا ہے
بہت بے سُرا گا رہا ہوں میں

اکھڑ گیا ہوں سچ کی ... س سے
مجھے اپنے قدموں کے نشان روندنے ہوں گے
اپنے بول واپس لینے ہوں گے
کوِتاؤں کو الٹا لٹکانا ہوگا
گھومتے ستاروں سیاروں کے درمیان

گھومتے برہمانڈ کے درمیان
سنائی دیتی ہے
کسی ماں کی لوری

لوری سے بڑا نہیں کوئی اپدیش
چولہے میں جلتی آگ سے بڑھ کر نہیں
کوئی روشنی

لگتا ہے میرا ہو رہا ہے
کسی اور جگہ انتظار
اور میں یہاں بیٹھا ہوں

ہزاروں پرندے

ہزاروں پرندے
میرے ذہن کے قیدی
سنتا ہوں دن رات میں
دیتے ہیں دہائی

رہائی
رہائی

ہم چاہے جا کر
کہیں چھلنی ہو جائیں
ہماری کایا سے بہنے لگیں گے
خون کے فوارے

ہم چاہے جا کر
کہیں جھلس جائیں
جل اٹھیں گے، ہمارے پروں کے

ریشمی کنارے

تو بس جانے دے اب
کہیں بھی ہمیں
تیری قید سے تو
بہتر ہیں ہمارے لیے
شکاری اور گوشت خور قصائی

جب پیڑ تھا تو
جب اترے تھے ہم
تیری شاخوں پر
تب تو نے کہا تھا
اڑو آکاش میں
جب تھک جاؤ
میرے پاس آؤ
جب اکتا جاؤ
تو پھر پر تولو
اور ہواؤں کے نام خط لکھتے جاؤ

تو ہمارے ہمیشہ کے لیے
پرواز کرنے سے
پتوں کے سوکھنے
جھڑنے سے ڈرتا تھا
تو اب پیڑ سے
پنجرا بن گیا ہے

اور موسموں کے آنے جانے سے ڈرتا
تو اپنے ہی دل کے دروازے پر لٹکا ہوا
کسی خوف کا تالا بن گیا ہے

ہم شبد تیرے
ہم بول تیرے
ہم تیرے اندر پڑے
مر رہے ہیں
وداع کر ہمیں
اور پنجرے سے تو ایک بار پھر پیڑ بن جا

فضاؤں میں گونجنے دے
مکتی کے نغمے
ہم سونے آکاش کو پھر آباد کر دیں گے
ہم اس ماتمی خاموشی کی جگہ
چار سو ترنّم ہی ترنّم تخلیق کر دیں گے

تو کیوں اپنے رستے پر
خود ہی کھڑا ہے
ذہن کے دروازے وا کرنے سے
خوف زدہ ہے

تو الاپ کر
کہ ندیاں پھر سے بہنے لگیں

تو الاپ کر
کہ ہوائیں پھر سے چلنے لگیں

تو پھر تحلیل کر
جام میں موت اور زندگی
پھر ٹھگ لے
ٹھگوں کے اس ٹھگ کو

اور اس طرح پنجرے سے
پھر سے پیڑ بن جا
اور شاخوں کی طرح ہواؤں میں جھومتا
خوشی اور اداسی میں
دیوانہ ہو جا

رہائی
رہائی

ہزاروں پرندے
میرے ذہن کے قیدی
سنتا ہوں دن رات میں
دیتے ہیں دہائی

رہائی
رہائی

میری کوِتا

میری ماں کو میری کوِتا سمجھ نہیں آئی
حالانکہ وہ میری مادری زبان میں لکھی ہوئی تھی

وہ تو صرف یہ سمجھی
کہ بیٹے کی روح کو کوئی دکھ ہے

'لیکن اس کا دکھ میرے ہوتے ہوئے
آیا کہاں سے'

بڑے غور سے دیکھی
میری اَن پڑھ ماں نے میری کوِتا:
'دیکھو لوگو!
کوکھ سے جنما
ماں کو چھوڑ کر
دکھ اپنا کاغذ کو سناتا ہے'

میری ماں نے کاغذ اٹھا کر سینے سے لگایا:
'شاید اس طرح ہی
کچھ نزدیک آ جائے میرے
میرا جنما۔'